ISSN 0974-7346

جنوری ۲۰۲۴ء

جلد ۲۱۱ ـــــ عدد ۱

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۳۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۳۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۳۵۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔

اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

(Ma'arif Section) 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۲۴ء عدد ۱

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
e-mail:
info@shibliacademy.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ماہ و سال کی گردش تو ازل سے قدرت کے مقرر کردہ دائرہ کی پابند ہے، البتہ سنین کے عدد وحساب کے مختلف پیمانوں کے لحاظ سے عیسوی سن اب ۲۰۲۴ء میں داخل ہوگیا، معارف کا یہ شمارہ بھی جلد کی ترتیب کے حساب سے اب نئے سال کا پہلا شمارہ ہے۔ ماہ و سال کے تغیر سے کبھی شاید انسانی احوال واعمال پر اثر ہوتا رہا ہو، مگر اب طاغوتی اور دجالی فتنوں کی کثرت نے گویا ہر موسم کی پہچان ہی مسخ کردی، اب نہ شکست ہے نہ فتح، نہ زندگی ہے نہ موت، نہ بہار ہے نہ خزاں، انسانوں کی بستی کو جانوروں کے جنگل میں اس طرح بدلتے ہوئے شاید زمانہ جاہلیت نے بھی نہ دیکھا ہو، غزہ پر اسرائیل کے وحشت ناک حملے دنوں اور ہفتوں سے تجاوز کر کے اب مہینوں میں داخل ہوگئے ہیں، بم باری، ناکہ بندی اور پھر شعلوں، چیخوں اور خون کے سیلابوں میں خبر رساں ذرائع کا ایک ہی کام رہ گیا ہے اور وہ ہے شہداء شماری اور کبھی اعداد وشمار کی دنیا میں یہ اعلان کہ اتنے لاکھ، غذائی کمی کا شکار ہیں، اتنے فلسطینیوں پر قحط کی قیامت آنے والی ہے یا اتنے لوگوں کے لیے اب پانی ہی نہیں، کبھی یہ خبر سرخیوں میں آتی کہ اسرائیل نے نہتے فلسطینیوں کو برق رفتاری سے قتل کر کے تاریخ کے خونی صفحات میں ایسا اضافہ کیا جس کی مثال شاید بخت نصر کی اسطوری قتل و غارت گری میں بھی نہ مل سکے۔ اور یہ کہ صہیونیوں نے صرف اڑتالیس دنوں میں جتنے فلسطینیوں کو شہید کیا ان کی تعداد افغانستان کی بیس سال کی جنگ میں جاں بحق ہونے والوں سے کہیں زیادہ ہے، یورپ و امریکہ کے استعماری علم وخبر نے لاشوں کی گنتی ہی کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا بلکہ مرنے والوں کی تعداد کے تقابلی تجزیہ کے ایک نئے علم کی بنیاد بھی ڈال دی۔ ایک خبر عالمی ادارہ صحت کی نسبت سے آئی کہ غزہ میں بم باری سے زیادہ انسانی زندگی کے لیے بیماریاں خطرہ بن گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ اسرائیلی صہیونی اگر فلسطین کے عوام کے جسموں کو لہو رنگ میں پیش کر رہے ہیں تو عالمی صہیونیت فلسطین کے نام سے مسلمانوں کو نفسیاتی لحاظ سے مجروح وشکستہ دیکھنے اور دکھانے میں مصروف ہیں۔ فلسطین ہو یا کوئی اور حق پر ایمان رکھنے والی سرزمین ہو، اس

کے چپے چپے کو زخموں میں بدلنے والی ہر ظالمانہ حرکت وسازش کی تہہ میں دیکھا جائے تو معرکہ صرف حق و باطل کا برپا ہے، کاش اسلام کا نام لینے والے اور ان ہی کے درمیان سے نکل کر حکمراں بننے والے اس حقیقت کو تسلیم کرنے والے بھی ہو جاتے کہ کفر وشرک محض ادیان کی کتابوں کی اصطلاحیں نہیں ہیں، یہ انسان کے ظلم کی بنیادیں ہیں، اسی لیے ظلم خواہ فلسطین میں ہو یا کسی بھی خطۂ زمین پر ہو، اس کا اصل چہرہ وہی ہوگا جس کی پہچان کبھی صلیبی اور کبھی صہیونی اور کبھی فسطائی جیسے الفاظ سے کی جاتی ہے۔حق یہی ہے کہ کفر وشرک ہی ظلم ہے۔

اصل معاملہ باطل کی اسی شناخت کا ہے، جن کے دل و دماغ کو حق و باطل کے فرق کو بھانپنے کی صلاحیت ملتی ہے، وہ اس کے اظہار میں پس و پیش کر ہی نہیں سکتے، غزہ کے معرکوں نے بہت سے بھولے ہوئے زخموں کا پتہ یاد دلا دیا۔نصف صدی قبل مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کا ایک واقعہ پیش آیا تھا، ۱۹۶۷ء کی اسرائیلی فتوحات کے بعد اس بے حرمتی کو ہمیشہ کی طرح دنیائے اسلام کے لیے بڑا سانحہ کہا گیا کہ یہ بین الاقوامی آئین وآداب کے خلاف ہے، اس سانحہ میں معارف نے یہ تاثر ظاہر کیا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں سے یہودیوں اور عیسائیوں کی دشمنی چودہ سو سال پرانی ہے، عارضی سیاسی مصالح کے علاوہ وہ کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے، جس پر خود قرآن مجید اور اسلامی تاریخ شاہد ہے۔ اسی عبارت میں صوفی منش اور گوشہ گیر معارف کے مدیر کی بصیرت نے یہ الفاظ ان کی زبان قلم کے سپرد کر دیے کہ'' آج بھی پوری عیسائی دنیا یہودیوں کی پشت پناہی کر رہی ہے، اس لیے عربوں اور یہودیوں کی جنگ سیاسی بھی ہے اور مذہبی بھی اور جنگ صلیبی کی طرح اس کا سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک مسلمانوں میں کوئی صلاح الدین ایوبی نہ پیدا ہو، یا وہ یہودیوں کے مقابلہ میں سپر نہ ڈال دیں، سپر نہ ڈالنے اور کامیابی حاصل کرنے کے دو ہی وسائل ہیں، ایمانی طاقت اور مادی قوت، یہ نہیں تو برے دن دیکھنے کے لیے عربوں کو تیار رہنا چاہیے، ورنہ قوانین قدرت ساری قوموں کے لیے یکساں ہیں، ان سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں''۔قریب نصف صدی بعد غزہ نے جس طرح ایمانی قوت کے ساتھ مادی قوت کے وسیلہ کو اختیار کیا، شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ خود بعض سرکردہ یہودی تجزیہ نگار دبے الفاظ ہی میں سہی اب کہتے نظر آتے ہیں کہ جان و مال کے زیاں کے باوجود فلسطینیوں نے اسرائیل کے سر پر غرور کو ایسی ضرب پہنچائی ہے جس کا یقیناً دوسرا نام شکست ہے۔ پندار تفوق، تکبر اور انا کی شکست کا

یہ منظر ہمیشہ سے حق و باطل کی جنگ گاہ یا معرکہ گاہ دکھلاتا آیا ہے، کتاب زندگی میں نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق کے الفاظ نے کائناتی معرکہ آرائی کی تصویر بہت پہلے دکھا دی ہے۔

معاملہ صرف ایک جگہ حق کی سربلندی اور باطل کی شکست کا نہیں ہے، اسلام دشمنی، باطل کے جسم میں سرایت کرنے والا وہ کینسر ہے جو ایک جگہ دب بھی جائے تو کہیں اور جگہ بنا لیتا ہے۔ اسلام دشمنی ہی باطل کی شناخت ہے، اور اس کائناتی سچائی سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ باطل کا وجود حق کے سامنے نہ آنے تک ہے۔ معاملہ حق و صداقت پر ایمان رکھنے کا ہے، ہمارے ملک عزیز میں بھی وہ منظر اب زیادہ نمایاں نظر آنے لگے ہیں جہاں جھوٹ، مکر اور فریب کے سہارے حقیقتوں کو جھٹلانے، آئین و دستور کی حرمت کو تاراج کرنے اور غرور و تکبر کے نشہ میں بنیادی انسانی قدروں کو پامال کرنے کی حرکتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، مسلم تاریخی حقائق کو مفروضوں میں بدل کر وقتی طور پر فائدوں کے حصول کے لیے جس طرح دروغ بافی کا بازار گرم کیا جا رہا ہے اس سے ملک سے محبت کرنے والوں کی تشویش میں اضافہ فطری امر ہے، خصوصاً اس اقلیت کے لیے جس کو ہر روز طعنوں ہی نہیں تعزیروں کا سامنے ہے، زبان، لباس، کھانا پینا، جیسی معاشرتی پہچانوں کی دشمنی، صدیوں سے زباں زد ناموں سے خواہ وہ شہروں کے ہوں یا تاریخی عمارتوں کے، ان سے بیزاری، عقائد اور مذہبی احکام پر قدغن، وقف کو اب گئے وقت سے تعبیر کیا جانا یہ ساری بیماریاں اب جس منظّم طریقہ سے پھیلائی جا رہی ہیں، اس کی سنگینی کو اگر ایمانی قوت اور مادی طاقت کے وسیلے سے نہیں سمجھا گیا تو پھر شاید بہت جلد اس سمجھنے اور سمجھانے کی مہلت بھی نہیں رہے گی۔

تازہ ترین خبر محض خبر نہیں کہ نئی دہلی میں ساڑھے تین سو سال کی قدیم سنہری باغ مسجد اب انہدامی شہادت کے لیے تیار کر دی گئی ہے، جو رائج الوقت دانش ور اور اصحاب رائے نہیں ہیں ان کی نظر میں اس مسجد کو ڈھا کر یہ معلوم کیے جانے کی خواہش ہے کہ مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں کا ردعمل کیا ہوگا۔ اگر یہ سوچ صحیح ہے تو نئی دہلی کی دیگر تمام مساجد کا بھی یہی حشر ہونے میں کسی اور صور کے پھونکے جانے میں زیادہ دیر نہیں، بات ۲۰۲۴ء کے آنے سے شروع ہوئی، ہمارے اربابِ قیادت کے لیے ۲۰۲۴ء اپنے دامن میں کیا لے کر آ رہا ہے، اس کو دیکھنے کی، خدا کرے کچھ توفیق ہو، اور اس سے بھی زیادہ ہر شخص کو اس لائق بننے کی توفیق ہو کہ وہ اس مرد راہ داں اور چارہ گر کی بازیافت میں کامیاب ہو جو انا لمدرکون کہنے والوں سے یقین سے کہہ سکے کہ کلا ان معی ربی سیهدین۔

مقالات

مولانا اسیر ادرویؒ کی تالیف
''تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ''

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
zafarul.islahi@gmail.com

سوانح نگاری یا تذکرہ نویسی تصنیف و تالیف کا بہت معروف میدان ہے جس میں ہر دور کے اصحابِ علم دلچسپی لیتے رہے ہیں اور اہلِ قلم اپنی تحریری صلاحیتیں صرف کرتے رہے ہیں۔ دوسری جانب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مطالعہ کا ذوق رکھنے والے قارئین تذکرہ کی کتابوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ تذکرہ لٹریچر مختلف پہلوؤں سے اہم اور مفید تصور کیا جاتا ہے، خاص طور سے ان وجوہ سے کہ اہلِ علم وفن، اصحاب قلم اور ملک وملت کے خادمین کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے قیمتی اسباق ملتے ہیں، دینی ودعوتی خدمت انجام دینے والوں کی قربانیوں سے واقفیت ہوتی ہے اور عبرت ونصیحت کی بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مزید یہ کہ کتبِ تذکرہ سے اہلِ قلم کی مصنفہ ومولفہ ومترجمہ کتب سے متعلق ضروری معلومات ملتی ہیں۔ ان سب کے علاوہ کتبِ تذکرہ کے مطالعہ سے جب ملک وملت کی فلاح و بہبود کی راہ میں قربانی دینے والوں یا لوگوں کی بھلائی وفلاح و بہبود کے لیے سرگرم رہنے والوں کے واقعات سامنے آتے ہیں تو کچھ کر گزرنے کا حوصلہ بیدار ہوتا ہے اور دینی وعلمی، ملی وملکی خدمت کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ ان سب کے علاوہ تذکرہ جات کی افادیت کا یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اصحاب تذکرہ کی خوبیوں و نیک خدمات کے ذکر سے اس خطہ یا ملک کی شہرت یا نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے جس سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔

پیش نظر کتاب کے مولفِ محترم نے مشاہیر کے تذکرہ سے متعلق کتابوں کی اہمیت وافادیت کا ایک اور پہلو اجاگر کیا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان میں علومِ اسلامیہ کے فروغ اور مسلم عہدِ حکومت کی تاریخ پر زبانی یا تحریری اظہارِ خیال کے ضمن میں یادگار شخصیات کا ذکر آتا ہے، ان کے حوالے سے بات کی جاتی ہے، بعض وقت ان کے افکار سے اتفاق اور کبھی ان کی تردید اور مخالفت کی جاتی ہے، اس لیے ان پر مطالعہ وتحقیق یا تصنیف وتالیف کے لئے ان کے ماحول، عہد، گرد وپیش کے حالات، عقائد وفکری

رجحانات سے واقفیت کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ان امور سے عدمِ واقفیت کی وجہ سے لغزشیں کھانے یا غلطیوں کے صدور کا امکان رہتا ہے[۱]۔

انہی وجوہ سے ہر زمانہ میں مختلف زبانوں میں تذکرے کی کتابوں کی تالیف میں دلچسپی کے ثمرات سامنے آتے رہے ہیں۔ برِّصغیر ہندوپاک میں اردوادب کا ذخیرہ بھی تذکرہ لٹریچر سے مالا مال ہے[۲]۔ مولانا محمد ادریس نگرامیؒ (م: ۱۹۱۲ء) کی تالیف کردہ کتاب ''تطییب الاخوان بذکر علماء الزماں ملقب بہ تذکرہ علمائے حال'' کو اردو میں علماء کا قدیم ترین تذکرہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس تذکرے کی تالیف میں علامہ شبلی نعمانیؒ کا مشورہ شاملِ حال رہا ہے[۳]۔ یہ کتاب پہلی بار نول کشور، لکھنو سے ۱۸۹۷ء میں طبع ہوئی تھی۔

زیرِ تعارف ''تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ'' (طبع اول / دارالمولفین، دیوبند، ۱۹۹۴ء)، جو مولانا نظام الدین اسیر ادرویؒ (۱۹۲۶ء۔۲۰ / مئی ۲۰۲۱ء) کی علمی یادگاروں کا ایک قیمتی حصہ ہے، مختلف اعتبار سے بڑی افادیت کا حامل ہے۔

اس کے مؤلف ممتاز عالمِ دین، معروف مصنف، جامعہ اسلامیہ (ریوڑی تالاب، وارانسی) کے سابق استاد اور اس ادارے کے ترجمان سہ ماہی ''ترجمان الاسلام'' کے مدیر رہے ہیں۔ مولانا مرحوم سے ناچیز کا تعارف جامعہ سلفیہ (وارانسی) میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ (م: ۳۰ / اکتوبر ۲۰۰۹ء) کی سربراہی میں علامہ ابن تیمیہؒ پر ۲۲۔۲۴ / نومبر ۱۹۸۷ء کو منعقدہ سیمینار میں شرکت کی یادگار رہے۔ اسی سیمینار کے دوران جامعہ اسلامیہ میں پہلی بار حاضری ہوئی اور مولانا اسیر ادرویؒ سے ملاقات کا شرف نصیب ہوا تھا، اور ان سے یہ پہلی ملاقات رفیقِ مکرم پروفیسر ظفر احمد صدیقیؒ (م: ۲۹ / دسمبر ۲۰۲۰ء) سے بھی تعارف کا ذریعہ بنی تھی۔ ظفر احمد صدیقی مرحوم کے مولانا ادروی مرحوم سے قریبی روابط تھے اور وہ ''ترجمان الاسلام'' کے مستقل قلمی معاونین میں سے بھی تھے۔ ظفر صاحب اس وقت بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت استاد سے وابستہ تھے اور فرصت کے اوقات میں جامعہ اسلامیہ میں

۱۔ اسیر ادروی، تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، دارالمولفین، دیوبند، ۱۹۹۴ء، ص ۵

۲۔ برصغیر میں اردو تذکرہ نگاری کی مختصر تاریخ اور اہم تذکرے کی اہم کتابوں کے عناوین کے لیے ملاحظہ کریں: ظفر الاسلام اصلاحی، مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی کی علمی یادگار ''تذکرہ علماء اعظم گڑھ''۔ ایک تعارفی مطالعہ، معارف، جون ۲۰۲۲ء، ص ۴۳۷۔۴۳۶

۳۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۲

اعزازی طور پر تدریسی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ حقیقت یہ کہ ان دونوں حضرات کی فرمائش کی تعمیل میں اس مبتدی کو ایک ادنیٰ مضمون نگار کی حیثیت سے ''ترجمان الاسلام'' کی بزم میں شریک ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ اس مجلّہ کے توسط سے مولانا اسیر ادرویؒ سے اس راقم عاجز کے روابط اور مضبوط ہوئے۔ بعد میں کسی اور کام سے اس ناچیز کا وارانسی جانا ہوتا تو دینی تعلیم کے دونوں مراکز میں حاضری دینے کی کوشش کرتا۔

۲۷۱ صفحات پر مشتمل زیرِ تعارف کتاب میں ۴۵۹ مشاہیر ہند کے احوال وکوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مشتملات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں عہدِ وسطیٰ، برطانوی دورِ حکومت اور جدید ہندوستان کے مشاہیر کے تذکرے کا احاطہ کیا گیا ہے اور مختلف طبقے (دینی، علمی، ملّی وملکی خدمات انجام دینے والے) کے مشاہیر ''تذکرہ مشاہیرِ ہند'' کی زینت بنے ہیں۔ اس میں جن اہلِ علم وفن اور خدّامِ ملک وملت کے تذکرے شامل ہیں وہ مختلف مکاتبِ فکر، فقہی مسالک اور فرقوں (مثلاً دیوبندی، بریلوی، سلفی، اہلِ تشیع) اور معروف مدارس (دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مظاہر علوم سہارن پور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ سلفیہ وارانسی، جامعہ اسلامیہ وارانسی، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، احیاء العلوم مبارک پور، جامعہ اشرفیہ مبارک پور) سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء میں دیوبندی حلقے کے علماء کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، جیسا کہ ''پیش لفظ'' میں مولف محترم نے اس کی وضاحت بھی فرمائی ہے: ''کتاب میں دبستان دیوبند کے ممتاز علماء و مشائخ اور اہم شخصیتوں کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہے''[۴]۔ کتاب میں مشاہیر ہند کی شخصیت کے جن پہلوؤں کو خاص طور سے نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، انہیں مولفِ گرامی نے اس طور پر واضح کیا ہے: ''میں نے کوشش کی ہے کہ شخصیات کو ظاہری و باطنی اعمال وافکار کی روشنی میں پہچان لیا جائے، اس لیے شخصیتوں کی تصویر کشی میں اسی رخ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے''[۵]۔

ہر صاحبِ تذکرہ کے ضمن میں ابتداء میں مقام وتاریخِ ولادت اور آخر میں مقام وتاریخِ وفات کے اندراج کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اگر مقام ولادت یا وفات غیر معروف ہے تو متعلقہ مقام کے ساتھ ضلع کا نام بھی تحریر کر دیا گیا ہے۔ تاریخ ولادت ووفات کے اندراج میں عام طور پر ہجری وعیسوی

۴۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ [پیش لفظ]، ص ۵

۵۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ [پیش لفظ]، ص ۶

دونوں سنین مذکور ہیں، البتہ ہجری سن کو اصل قرار دیا گیا ہے اور اس کا مطابق عیسوی سن بین القوسین درج کیا گیا ہے۔ اگر صاحبِ تذکرہ سے متعلق ماخذ میں صرف عیسوی سن ولادت/وفات مذکور تھا تو اس کا مطابق ہجری سن بین القوسین دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس صورت میں عیسوی سن بین القوسین مندرج ہے اور اگر ماخذ میں دونوں سن موجود تھے تو بعینہٖ وہی مندرج کیا گیا ہے۔ شخصیات پر سوانح یا تذکرے کی کتابوں میں زیرِ تعارف شخصیت کی ولادت و وفات کی تاریخ (ہجری و عیسوی دونوں سن کے مطابق) اور ان کے مقام کی صراحت کم ہی ملتی ہے، اس لحاظ سے زیرِ تعارف تذکرہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

بہت سے اصحابِ تذکرہ کے نام سے قبل ''مولانا''، ''مولوی''، ''علامہ''، ''مفتی''، قاضی''، ''شاہ'' کا لاحقہ بھی مندرج ہے، لیکن ترتیب اصل نام کے حرف تہجی کے اعتبار سے ہی قائم کی گئی ہے۔

اہلِ قلم مشاہیر کی علمی خدمات کے ذکر میں ان کی مصنفہ/مرتبہ/مترجمہ کتاب/کتابوں کا نام کا بھی درج کیا گیا ہے۔ جو مشاہیر تدریسی، انتظامی، اداراتی وملی ذمہ داریوں سے منسلک رہے ہیں ان کے تذکرے میں اس کی وضاحت بھی ملتی ہے۔

حجم کے اعتبار سے تذکروں میں یکسانیت نہیں پائی جاتی، کچھ طویل، کچھ مختصر، بعض انتہائی مختصر، بعض ایک سطر سے بھی کم ہیں، بعض شخصیات کے ضمن میں صرف تاریخ ولادت و وفات کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ غالباً اصحابِ تذکرہ سے متعلق فراہم شدہ معلومات میں کمی بیشی کی وجہ سے زیرِ تعارف تذکرہ کے مشتملات میں عدمِ یکسانیت درآئی ہے۔

پیشِ نظر تذکرہ بنیادی طور پر غیر منقسم ہندوستان کے مشاہیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ضمن میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس کتاب میں متعدد ایسے مشاہیر کا تذکرہ شامل ہے جن کی پیدائش اور نشو ونما غیر منقسم ہندوستان کے کسی ایسے علاقہ میں ہوئی (اور پوری زندگی وہیں گذری) جو تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کا حصہ بنا، مثلاً شیخ محمد اکرام، مولانا محمد صادق کراچوی[۶]۔ اسی طرح بعض ایسے علماء و مصنفین کے تذکرے بھی اس میں ملتے ہیں جن کی زندگی کا بیشتر یا کچھ حصہ ہندوستان میں گذرا اور وہ دوران تقسیم یا بعد میں پاکستان کے کسی شہر میں سکونت پذیر ہو گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مزید یہ کہ اس میں کچھ ایسے مشاہیر کے حالات بھی مذکور ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں بسر ہوا

۶۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۲۵۔۱۲۷

اور وہ تقسیم کے کئی برس بعد پاکستان منتقل ہوئے اور چند برس بعد وہیں وفات پائی، مثلاً مولانا سید سلیمان ندویؒ (م:۱۹۵۳ء)[۷]۔ان کے علاوہ بعض ایسے اہل علم کا تذکرہ بھی اس کتاب میں شامل ہے جن کی ولادت ووفات دونوں حرمین شریفین میں سے کسی شہر میں ہوئی اور وہ ہندوستان میں محض یہاں کے بعض علماء سے اکتساب فیض یا مشہور مدارس و کتب خانوں سے استفادہ کی غرض سے کچھ عرصہ مقیم رہے۔مثلاً شیخ احمد بن عثمان المکّی ثمّ الھندی (م:۱۹۱۰ء) کی پیدائش مکہ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ہندوستان ورود فرما ہوئے، مختلف علماء ومحدثین سے تفسیر وحدیث کے باب میں کسب فیض کرتے رہے اور یہاں کے بعض مشائخ کی صحبتِ میں رہے، اس ملک کے مشہور مدارس اور معروف لائبریریوں سے استفادہ کیا اور تصنیفی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔آخرِ عمر میں حجاز واپس چلے گئے اور مدینہ منورہ میں وفات پائی[۸]۔ایسے حضرات کے تذکرے بظاہر کتاب کے عنوان (تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ) سے میل نہیں کھاتے۔اسی طرح اس کتاب میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (م:۱۱۶۷ء) کے تذکرہ[۹] کی معنویت یا مناسبت سمجھ میں نہیں آسکی۔

پیش نظر تذکرہ، تاریخِ ہند کے تینوں معروف ادوار کی علمی و مذہبی شخصیات اور ملی وملکی خدمت گاروں کے احوال و کارناموں کو اجاگر کرتا ہے۔عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کے گیارہ مشاہیر کے تذکرے اس کتاب کی زینت بنے ہیں، ان میں کچھ ممتاز شخصیات یہ ہیں: سید سالار مسعود غازیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ نصیرالدین چراغِ دہلیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شیخ سلیم چشتیؒ، خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ، خواجہ گیسودرازؒ، شیخ طاہر پٹنیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔زمانی ترتیب کے لحاظ سے اس کتاب کا قدیم ترین تذکرہ سید سالار مسعود غازیؒ (م:۱۰۳۲ء) کا ہے اور آخری تذکرہ محمد مسلم بھوریؒ کا ہے جن کا سنِ وفات جولائی ۱۹۹۳ء ہے۔یہاں یہ واضح رہے کہ پیش لفظ کے آخر میں مولفِ گرامی کے نامِ نامی کے نیچے مندرج تاریخ ۲؍فروری ۱۹۹۳ء ہے اور کتاب کا سن طباعت ۱۹۹۴ء ہے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتاب کے پریس میں جانے تک مولف محترم مرحوم اس کے مشتملات میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔

۷۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص۱۱۱۔۱۱۲

۸۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص۲۴۔۲۵

۹۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص۱۷۶

''مشاہیر ہند'' کی زبان اور بیان کی خوبیوں (بالخصوص زبان کی سادگی اور آسان اسلوب بیان) سے بھی مزین ہے۔ اس میں ادبی لطافت کی چاشنی پائی جاتی ہے اور کچھ مقامات پر برمحل اشعار کا استعمال بھی ملتا ہے۔ بعض شخصیات کے تذکرہ میں مصنفِ محترم نے ادبی لطافت کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں اور چند مختصر جملوں میں معانی کا دفتر اس طرح سمو دیا ہے کہ وہ ایک طویل تحریر پر بھاری نظر آتے ہیں۔ ممتاز عالم اور نامور ادیب مولانا ماہر القادریؒ (م: ۱۹۷۸ء) کی مشہور کتاب ''دُرِّ یتیم'' کا ذکر کرتے ہوئے مولفِ گرامی رقم طراز ہیں:

سیرت پر ان کی کتاب ''دُرِّ یتیم'' ایک بہت ہی خوب صورت تحریر ہے، اس کو پڑھیے تو چمن زار افکار میں موسمِ بہار کی ہوائیں سرسرانے لگتی ہیں۔ ''کاروانِ حجاز'' میں اپنے سفر حج کی روداد بڑے والہانہ اور سرشارانہ انداز میں قلم بند کی ہے۔[۱۰]

بزرگ شاعر مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھیؒ (م: ۱۹۹۱ء) کے تذکرے میں ان کے مجموعۂ کلام ''عرفانِ محبت'' کا مختصر تعارف ملاحظہ فرمائیں:

آپ کا مجموعۂ کلام ''عرفانِ محبت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک ایسی محبت کی ترجمانی ملتی ہے جو اس مادّی دنیا سے ماوراء ہوتی ہے، جس میں سوز و گداز کو ایسی کیفیت و سرشاری میں بدل دیا گیا ہے کہ غم و مصائب میں بھی لذت انگیزی محسوس ہوتی ہے اور درد و کرب میں بھی سرمستی و سرشاری اور سرخوشی پھوٹی پڑتی ہے۔[۱۱]

تبلیغی جماعت کے بانیِ محترم مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ (م: ۱۹۴۲ء) کی میوات کے علاقے میں تبلیغی سرگرمیوں، اس خطّے کے دیہاتی عوام میں دین کی روح پھونک دینے اور انہیں داعی کی حیثیت سے کھڑا کر دینے کی تصویر کشی مولانا ادروی مرحوم ہی کے الفاظ میں قابلِ نقل ہیں:

آپ کی انتھک جدوجہد نے ان [میواتیوں] میں انقلابِ عظیم پیدا کیا، ان کو دین کے صراطِ مستقیم پر لگایا، ان کے ظاہر و باطن کو اسلام کے روشن و تابناک سانچے میں ڈھالا اور صرف ان کی اصلاح ہی نہیں کی، بلکہ ان کو اسلام کا داعی بنا دیا اور ان میں اتنی صلاحیتیں پیدا کر دیں کہ وہ خود اب ملکوں ملکوں گھوم پھر کر اسلام کا پیغام عوام تک پہونچانے لگے:

۱۰۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۲۱

۱۱۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۸

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے		کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا[۱۲]

مفتی عنایت احمد کاکورویؒ (م: ۱۸۶۳ء) کے تذکرے کے آخر میں ان کی وفات کا عبرت ناک واقعہ بیان کرتے ہوئے بھی مولانائے گرامی نے بہت برمحل شعر نقل کیا ہے: جزیرہ انڈمان (یعنی کالے پانی) سے ''ہندوستان واپسی کے کچھ دنوں بعد [مفتی صاحب] سفرِ حج کے ارادے سے نکلے، سفر پانی کے جہاز سے تھا۔ جدہ کے قریب پہنچ کر جہاز چٹان سے ٹکرا گیا اور ڈوب گیا:

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند		دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا''[۱۳]

زیرِ مطالعہ کتاب کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے ممتاز شخصیات کی حیات و خدمات کے بارے میں عام معلومات کے علاوہ بعض مشاہیر کے تذکرے سے ضمناً کچھ قیمتی و مفید معلومات بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا عبید اللہ الپائلی سندھی (م: ۱۸۹۳ء) کی علمی خدمات میں یہ مذکور ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب (تحفۃ الہند) کے مصنف تھے جو بہت سے لوگوں (بشمول نامور مصنف اور مفکر مولانا عبید اللہ سندھیؒ) کے اسلام سے مشرف ہونے کا وسیلہ بنی[۱۴]۔ اس ضمن میں اہم بات یہ کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے خود اپنی ایک تحریر میں اس کتاب کے مشتملات سے متاثر ہو کر اسلام کی نعمت سے سرفراز ہونے کا ذکر کیا ہے، ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''سب سے پہلے جس کتاب نے مجھے اسلام کے متعلق صحیح واقفیت دی، اور ہندو سوسائٹی میں رہ کر میں سولہ برس کی عمر سے پہلے مسلمان ہو گیا وہ ''تحفۃ الہند'' ہے''[۱۵]۔ نیز یہ کہ صاحبِ ''تحفۃ الہند'' کے تذکرے میں ان کی نسبت ''الپاٹلی'' لکھی ہوئی ہے[۱۶] ''نزھۃ الخواطر'' میں ''الپائلی'' مذکور ہے[۱۷]۔ یہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مولانا ابوالقاسم ہنسوی فتح پوری (م: ۱۹۱۱ء) کی علمی خدمات میں سیرتِ نبویؐ پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی رسالہ ''سرور المحزون'' (جو اصلاً ابن سید الناس کی عربی کتاب ''نور العین فی سیرۃ النبی المامون'' کا ترجمہ ہے) کے اردو ترجمہ

۱۲۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۴۱

۱۳۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۰۱

۱۴۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۸۹

۱۵۔ مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں، مرتبہ: مولانا محمد عمران خاں ندوی رترتیب جدید و حواشی: فیصل احمد ندوی، مکتبۃ الشباب العلمیہ لکھنؤ، ۲۰۲۱ء، ص ۵۵

۱۶۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۸۹

۱۷۔ سید عبدالحی، نزھۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء، ۳۰۲/۸

(بعنوان ''نورٌ علیٰ نور'') کا ذکر ملتا ہے[۱۸]۔ یہاں یہ واضح رہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ فارسی رسالے کے متعدد اردو تراجم دستیاب ہیں، جیسا کہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (م: ۱۵؍ستمبر ۲۰۲۰ء) نے رسالہ ''سرور المحزون'' کے تعارف میں اس کے چھ اردو تراجم کی ضروری تفصیلات پیش کی ہیں۔ اس تعارف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالقاسم ہنسوی کا ترجمہ قدیم ترین ہے جو پہلی بار ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء میں ٹونک (راجستھان) سے شائع ہوا تھا، لیکن پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اس ترجمے کا نام ''عین العیون'' تحریر فرمایا ہے[۱۹]۔ مولانا عبدالحق شیخ الدلائل (م: ۱۹۱۵ء) سے متعلق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ الٰہ باد کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس سے منسلک رہے اور اسی کے ساتھ انہوں نے کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک تفسیر ''الاکلیل'' تالیف کی تھی۔ اس سے متعلق ایک قابلِ ذکر بات یہ تحریر کی گئی ہے کہ مفسرِ گرامی نے رسڑا، بلیا (جہاں وہ ایک مدرسہ میں معلّم تھے) میں خاص طور سے تفسیر کی طباعت کے لئے ایک پریس ''اکلیل پریس'' کے نام سے قائم کیا تھا[۲۰]۔ شاہ بدرالدین پھلواروی (م: ۱۹۲۲ء) کے تذکرہ میں یہ اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے انگریز حکومت کی جانب سے عطا کردہ ''شمس العلماء'' کا خطاب اس واقفیت کے بعد واپس کردیا تھا کہ انگریز حکومت خلافتِ عثمانیہ کی دشمن ہے اور اس کو ختم کرنے پر تُلی ہوئی ہے[۲۱]۔ مولانا عین القضاۃ لکھنویؒ (م: ۱۹۲۴ء) ایک طویل عرصہ تک مدرسہ فرقانیہ (لکھنؤ) میں تدریسی اور انتظامی ذمہ داریوں سے منسلک رہے ہیں۔ زیرِ تعارف کتاب میں ان کی وفات کا عبرت ناک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: ''ایک ایرانی شاعر [ان کے پاس] آیا، اس نے ایک نظم حضرت علیؓ کی طرف منسوب کر کے سنائی، مولانا موصوف کو وجد آ گیا اور دیر تک رہا۔ جذب و کیف اور سرمستی اتنی بڑھی کہ وہ اپنے وجود سے بے خبر ہو گئے اور اسی کیفیت میں طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا''[۲۲]۔

۱۸۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۵

۱۹۔ شاہ ولی اللہ کا رسالہ سرور المحزون فی ترجمہ نور العین، مرتبہ محمد یٰسین مظہر صدیقی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، مظفر نگر، ۲۰۰۶ء، (ص X: دس)

۲۰۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۵۷

۲۱۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۶۰

۲۲۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۰۴

اردو مطبوعات کی فہرست سازی یا ان کی ایک جامع کتابیات کی تیاری علامہ شبلی کی علمی دلچسپیوں کا ایک اہم پہلو رہا ہے۔ انہوں نے اس نوعیت کے بعض کام خود کیے تھے، مثلاً ''تراجم'' کے عنوان سے ۱۸۸۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے تحریر کردہ مقالہ (مشمولہ ''مقالاتِ شبلی، جلد ششم، حصہ دوم) میں زیرِ بحث موضوع پر مفید مباحث کے علاوہ مختلف زبانوں کی کتب کے عربی تراجم سے متعلق مختلف نوعیت کی فہرستیں بھی مرتب کی ہیں۔ اسی طرح دوسروں کو بھی اس نوع کے کاموں کی ترغیب دیتے تھے اور اگر کوئی صاحبِ قلم اس قسم کے کام کے لیے ان سے تعاون طلب کرتے تو ان کی معاونت میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبہ کے طور پر قائم انجمن ترقی اردو کے اولین سکریٹری کی ذمہ داری علامہ شبلی کو تفویض ہوئی تھی۔ ان کی ایماء پر مرزا محمد سجاد بیگ دہلوی (م: ۱۹۱۷ء) اردو مطبوعات کی ایک فہرست یا کتابیات تیار کرنے میں مصروف ہوئے تھے، لیکن بعض وجوہ سے یہ کتابیات ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی کی انجمن کی ذمہ داری سے سبک دوشی کے کافی عرصے بعد مکمل ہو کر ''الفہرست'' کے نام سے ۱۹۲۳ء میں اشاعت پذیر ہوئی [۲۳]۔ زیرِ تعارف کتاب میں حکیم حبیب الرحمٰن [ڈھاکہ] (م: ۱۹۴۷ء) کے تذکرے میں مولف محترم نے یہ ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ علامہ شبلی سے ملاقات کے دوران انہوں نے مشہور عربی تالیف ''کشف الظنون'' کے طرز پر ہر صوبہ کی تصانیف پر ایک مفصل کتاب تالیف کرنے کی تجویز رکھی تو علامہ شبلی نے اس کی تحسین و تائید کی اور بنگال کے مصنفین اور ان کی تصانیف کے تعارف کا کام خود حکیم صاحب کے سپرد کیا اور انہوں نے اسے منظور کر کے مفوضہ کام شروع بھی کر دیا تھا [۲۴]۔ کسی ذریعے سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کتاب مکمل ہو کر شائع ہو گئی تھی کہ نہیں۔ مذکورہ اطلاع اس لحاظ سے قیمتی ہے کہ علامہ شبلی پر معروف کتب حکیم صاحب کی اس تجویز اور علامہ شبلی کی اس کی تائید و تحسین کے ذکر سے خالی ہیں۔ ایک مدیر کی حیثیت سے مولانا ماہر القادریؒ (م: ۱۹۷۸ء) کی علمی خدمات کے ذیل میں یہ مذکور ہے کہ: ''تقریباً تین ہزار نئی شائع ہونے والی کتابوں پر انہوں نے بہترین تبصرے لکھے ہیں اور کئی سو افراد کے انتقال پر تعزیت نامے تحریر کیے ہیں جو رسمی نہیں، بلکہ اس شخصیت کی ایک واضح تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ شخصیت کے اچھے و

۲۳۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۴۰۷؛ مکتوباتِ شبلی، مرتبہ: محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۱۹۱۲ء، ص ۸۸، حاشیہ نمبر ۲

۲۴۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۷۴-۷۵

برے جتنے پہلو ہیں بلا کم و کاست پوری دیانت داری کے ساتھ بیان کر دیے ہیں''[۲۵]۔

مشاہیر ہند کے حالاتِ زندگی یا ان کی علمی خدمات کے ذیل میں کچھ مقامات پر کچھ ضروری یا مفید معلومات درج ہونے سے رہ گئی ہیں یا جمع کردہ معلومات میں ضروری وضاحت نہیں ہوسکی ہے، ان میں سے بعض شخصیات کے تذکرے کے ضمن میں اہم معلومات کا اضافہ یا ضروری وضاحت کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا:

مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ (م: ۱۸۸۷ء) کے تذکرے میں ان کے نامور تلامذہ میں مولانا شبلیؒ کا نامِ نامی بھی شامل ہے[۲۶] لیکن مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ذکر نہیں آ سکا ہے، جب کہ انہیں بھی لاہور میں مولانا سہارن پوری سے شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے[۲۷]۔ اسی ضمن میں یہ اضافہ بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فراہی نے حیدر آباد قیام کے دوران اپنے استادِ گرامی (مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ) کا عربی کلام ''دیوان الفیض'' کے نام سے مرتب کیا تھا جو پہلی بار مطبعۃ اختر، حیدر آباد سے ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء طبع ہوا تھا[۲۸]۔ مولوی محمد شفیعؒ (م: ۱۹۴۵ء) کی علمی و ملّی خدمات کے ضمن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ''مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر کے بانی ہیں''[۲۹]۔ اس ضمن میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے اصلاً فروری ۱۹۰۴ء میں ''انجمن اصلاح المسلمین'' کی بناڈالی تھی، جس کے تحت خطۂ اعظم گڑھ میں اصلاحِ معاشرہ کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس کا خاص مقصد مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کو بدعات اور غیر اسلامی رسوم و رواج سے پاک کرنے کی مہم جاری رکھنا تھا۔ اسی انجمن کی بنیاد پر انہوں نے ۱۹۰۸ء میں مدرسہ اصلاح المسلمین قائم کیا جو بعد میں (۱۹۲۷ء سے) مدرسۃ الاصلاح کے نام سے معروف ہوا[۳۰]۔ شاہ معین الدین ندویؒ (م: ۱۹۷۴ء) کے تذکرے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''آپ کا وطن رودولی (ضلع بارہ بنکی) تھا، زندگی کا زیادہ حصہ دار المصنّفین اعظم گڑھ میں گذرا، رسالہ معارف

۲۵۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۲۱

۲۶۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۱۳

۲۷۔ شرف الدین اصلاحی، ذکرِ فراہی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۷۔۱۳۸

۲۸۔ حیاتِ شبلی، محولہ بالا، ص ۱۴۰، حاشیہ نمبر ۱؛ عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی (مرتب)، مختصر حیاتِ حمید (مرتبہ/دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، ۱۹۷۳ء، ص ۱۸؛ ظفر الاسلام اصلاحی، کتابیاتِ فراہی، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۔۳۶

۲۹۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروان رفتہ، ص ۱۲۲۔۱۲۳

۳۰۔ شرف الدین اصلاحی، ذکرِ فراہی، محولہ بالا (ابواب: انجمن اصلاح المسلمین کا قیام/ بانیِ انجمن محمد شفیع خاں/ مدرسہ کا قیام اور تاریخ آغاز)، ص ۳۴۶۔۳۵۵، ۴۲۴

کے مدیر رہے"[۳۱]۔ دارالمصنّفین میں شاہ صاحب کی ذمہ داریوں کی نسبت سے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹۵۰ء میں سید سلیمان ندویؒ کے پاکستان منتقل ہوجانے کے بعد مارچ ۱۹۵۱ء میں وہ دار المصنفین کے ناظم منتخب ہوئے اور وفات (۱۲/دسمبر ۱۹۷۴ء) تک اس منصب پر فائز رہے اور اسی کے ساتھ رسالہ "معارف" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے[۳۲]۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ (م:۱۹۸۵ء) سے متعلق یہ مذکور ہے کہ "وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے ناظم ہوئے، پھر صدرِ شعبہ ہوکر رٹائر ہوئے"[۳۳]۔ مولانا مرحوم (ناظمِ دینیات کے بجائے) صدرِ شعبہ دینیات (سنی) اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کے منصب پر فائز رہے تھے[۳۴]۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہویؒ (م:۱۹۸۸ء) کے تذکرے میں یہ ذکر ہے کہ "رسالہ الفرقان کا فریدی نمبر بھی شائع ہوا تھا"[۳۵]۔ اس سے متعلق یہ واضح رہے کہ یہ نمبر الفرقان لکھنؤ کے مئی ۔ اگست ۱۹۸۹ء کے شمارہ کے طور پر "مولانا نسیم احمد فریدی نمبر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

اس کتاب کے مشتملات میں بعض مقامات پر اس کے مندرجات مشتبہ/غیر مصدقہ یا واقعیت کے خلاف نظر آتے ہیں۔ کتبِ تذکرہ، جیسا کہ ہم سب بخوبی واقف ہیں، مآخذ یا مراجع کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، اس لیے جن مشاہیر کے تذکرے میں اس طرح کی باتیں یا فروگذاشت نظر سے گزری ہیں، ان کی نشان دہی مفید معلوم ہوتی ہے۔ علامہ شبلیؒ (م:۱۹۱۴ء) کی مصروفیات کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ وہ "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے استاذ، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیم، دارالمصنّفین جیسے مثالی ادارہ کے بانی ہیں"[۳۶]۔

۳۱۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروان رفتہ، ص۲۴۴

۳۲۔ کلیم صفات اصلاحی، دارالمصنّفین کے سو سال، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص۸۲۔۸۴

۳۳۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروان رفتہ، ص۱۰۹

۳۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ احوال وآثار، مرتبہ محمد سعود عالم قاسمی، شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء (مقالہ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی بعنوان "مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور فیکلٹی دینیات کی سربراہی)، ص۳۸۔۴۸

۳۵۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص۲۵۴

۳۶۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص۱۱۸

علامہ شبلی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بجائے) ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے (شعبہ عربی و فارسی میں) استاد (پروفیسر) رہے ہیں [۳۷]۔اسی طرح مولانا الطاف حسین حالیؒ (م:۱۹۱۵ء) کے بارے میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ''مسلم یونیورسٹی ،علی گڑھ سے وابستہ رہے'' [۳۸]۔ یہ بخوبی معلوم ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام ۱۹۲۰ء میں عمل میں آیا تھا۔مولانا حالی، جیسا کہ بخوبی معروف ہے، سرسید کے قریبی رفقاء اور علی گڑھ تحریک کے زبردست حامیوں میں سے تھے، ان کی مولفہ کتاب ''حیاتِ جاوید'' اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔وہ مدرسۃ العلوم/ایم۔اے۔او کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے اس سے وابستہ رہے ہیں اور وقتاً فوقتاً وہ کالج کیمپس میں قیام بھی کرتے تھے اور سرسید علیہ الرحمۃ اس پر بڑی مسرت ظاہر کرتے تھے، جیسا کہ انھوں نے اپنی ایک تحریر میں واضح طور پر اس کا ذکر کیا ہے [۳۹]۔مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (م:۱۹۲۰ء) کے تذکرے میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو انگریزی حکومت کے احکام کے تحت چل رہی تھی ، اس کے مقابلہ میں ایک آزاد یونیورسٹی ''جامعہ ملیہ'' کی بنیاد ڈالنے والوں میں [وہ] ہیں'' [۴۰]۔ ملک میں کوئی بھی تعلیمی ادارہ حکومتِ وقت کے عام قانون یا ضوابط سے بالکل آزاد نہیں رہ سکتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے (پارلیمنٹ سے منظور شدہ) اپنے قوانین وضوابط تھے جن کے تحت اس کا نظم ونسق چلتا تھا اور ایک طرح سے وہ بہت سے امور میں خود مختار تھی، اس لیے ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' سے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ وہ انگریزی حکومت کے احکام کے تحت چل رہی تھی۔مولانا حمید الدین فراہیؒ (م:۱۹۳۰ء) کے تذکرے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ ''وہ کچھ دن کراچی میں بسلسلۂ تدریس رہے، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے آئے'' [۴۱]۔اس ضمن میں یہ واضح رہے کہ مولانا فراہی سرسید کے عہد میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں زیرِ تعلیم رہے ہیں اور ان کے جانشیں نواب محسن الملک کے دور میں اسی کالج (نہ کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں تقریباً دو برس (۱۹۰۷ء۔۱۹۰۸ء) اسسٹنٹ پروفیسر عربی کے منصب پر فائز رہے ہیں [۴۲]۔اسی کتاب میں ان کی

۳۷۔ظفر الاسلام اصلاحی، علامہ شبلی کے ایّامِ علی گڑھ، مجلّہ علوم اسلامیہ (شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) خصوصی اشاعت۔علامہ شبلی نمبر، جلد نمبر۔۳۱۔۳۳، شمارہ نمبر۔۱۔۲، ۲۰۱۲ء۔۲۰۱۴ء، ص ۸۷

۳۸۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص ۴۲

۳۹۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۴ر جولائی ۱۸۹۳ء، ص ۶۴۸

۴۰۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص ۲۳۳

۴۱۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص ۸۳

۴۲۔ ظفر الاسلام اصلاحی، کتابیاتِ فراہی [تعارف مولانا حمید الدین فراہی]، محولہ بالا،ص ۱۰۔۱۲

وفات کا مقام'' پھریہا لکھا ہوا ہے[۴۳]۔ صحیح یہ ہے کہ ان کی وفات و تدفین ''متھرا'' میں ہوئی جہاں وہ اپنے ذاتی معالج ڈاکٹر حافظ حفیظ اللہ سول سرجن، اسپتال متھرا (ساکن بکھرا، اعظم گڑھ) کے زیرِ علاج تھے[۴۴]۔ مولانا احسن مارہرویؒ (م: ۱۹۴۰ء) کے تذکرے کے آخر میں سنِ وفات غلط (۱۹۳۰ء) درج ہوگیا ہے، صحیح ''۱۹۴۰ء'' ہے، جیسا کہ ہجری تاریخ میں مندرج سنِ وفات (۱۳۵۹ھ) کا عیسوی مطابق ۱۹۴۰ء ہی ہوتا ہے[۴۵]۔ یہاں یہ اضافہ بے موقع نہ ہوگا کہ مولانا احسن مارہروی پر ناچیز کا مفصل مضمون سہ ماہی ''فکر ونظر'' علی گڑھ کے خصوصی شمارہ ''ناموران علی گڑھ'' میں ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا[۴۶]۔ مولانا عبدالغنی پھول پوریؒ کے تذکرے میں یہ تحریر کیا گیا ہے: ''آپ کا وطن پھول پور ضلع اعظم گڑھ ہے''[۴۷]۔ صحیح بات یہ کہ مولانا پھول پوریؒ کا اصل وطن اعظم گڑھ کا معروف گاؤں ''چھاؤں'' تھا۔ ان کے بعض قریبی اعزہ کے بیان کے مطابق وہ اہل وعیال کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں چھاؤں سے پھول پور منتقل ہوئے اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، اسی وجہ سے وہ ''پھول پوری'' کی نسبت سے مشہور ہوگئے۔

زیرِ مطالعہ کتاب میں معروف مصنف اور سابق ناظم دارالمصنّفین شاہ معین الدین ندوی مرحوم (م: ۱۹۷۴ء) کی تاریخِ ولادت (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء) اور تاریخِ وفات (۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) مندرج ہے[۴۸]۔ یہ دونوں تاریخیں غلط چھپی ہوئی ہیں۔ عیسوی سن کے مطابق ان کا صحیح سنِ ولادت ''۱۹۰۳ء'' اور تاریخِ وفات ''۱۳/دسمبر ۱۹۷۴ء'' ہے[۴۹]۔ مولانا عبدالسلام قدوائیؒ (م: ۱۹۷۹ء) کے تذکرے میں ان کی علمی خدمات سے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''رسالہ معارف، دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے شذرات بھی ایک عرصہ تک لکھتے رہے''[۵۰]۔ اس سلسلہ میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳/دسمبر

۴۳۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۸۳

۴۴۔ ذکرِ فراہی، محولہ بالا، ص ۴۵۶۔۴۵۷؛ کتابیاتِ فراہی [تعارف مولانا حمید الدین فراہی]، محولہ بالا، ص ۱۰۔۱۲

۴۵۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۵

۴۶۔ ظفر الاسلام اصلاحی، مولانا احسن مارہروی، فکر ونظر، علی گڑھ، جلد نمبر۔۲۴/جنوری ۱۹۸۷ء (ناموران علی گڑھ، تیسرا کارواں، جلد اول)، ص ۴۹۔۵۵

۴۷۔ تذکرہ مشاہیر ہند۔ کاروان رفتہ، ص ۱۷۵

۴۸۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۴۴۔۲۴۵

۴۹۔ محمد الیاس اعظمی، شاہ معین الدین ندویؒ۔ حیات وخدمات، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۳۲، ۵۲

۵۰۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۶۹

۱۹۷۴ء کو شاہ معین الدین ندویؒ کی وفات کے بعد مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ مارچ ۱۹۷۵ء سے اگست ۱۹۷۹ء تک دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے شریکِ ناظم اور رسالہ ''معارف'' کے شریک مرتب کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ''معارف'' کے مارچ ۱۹۷۵ء سے اگست ۱۹۷۹ء تک کے شماروں پر ''مرتبہ'' کے بعد یہ اسماء گرامی ساتھ ساتھ ملتے ہیں: ''سید صباح الدین عبدالرحمٰن/عبدالسلام قدوائی ندوی''[۵۱]۔ ممتاز مورخ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی (م:۱۹۸۱ء/ولادت: پٹیالی، ضلع ایٹہ/موجودہ ضلع کاس گنج/وفات: لاہور) کا نامِ نامی پیشِ نظر تذکرہ میں ''اشتیاق احمد قریشی'' مندرج ہے[۵۲]۔ ان کا صحیح نام ''اشتیاق حسین قریشی''، جیسا کہ ان کی کتابوں پر ملتا ہے۔ الحاج عبیدالرحمٰن خاں شروانیؒ (م:۱۹۹۲ء) کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ وہ ''مسلم یونیورسٹی کے تاسیسی ممبروں میں سے تھے اور ایک وقت میں اس کے وائس چانسلر بھی رہے''[۵۳]۔ اصل بات یہ ہے کہ جناب عبیدالرحمٰن خاں شروانیؒ تقریباً ۲۲ برس تک مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرر رہے ہیں، اسی حیثیت سے کئی بار انھوں نے قائم مقام وائس چانسلر کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ وہ ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی کے پُرو چانسلر کے منصب پر بھی فائز ہوئے تھے[۵۴]۔

فاضل تذکرہ نگار نے اہلِ قلم کے تذکروں میں ان کی کتابوں کے نام درج کرنے کا اہتمام کیا ہے، تاہم کچھ شخصیات کے ضمن میں ان کی بعض اہم یا معروف کتب کا ذکر رہ گیا ہے یا ان سے متعلق بعض ضروری وضاحت نہیں ہوسکی ہے۔ اس سے متعلق کچھ تفصیل مناسب معلوم ہوتی ہے۔ سرسید احمد خاں (م:۱۸۹۸ء) کے تذکرے میں مصنف گرامی نے ان کی تصانیف میں ''تفسیر القرآن'' اور ۱۸۵۷ء

۵۱۔ حضرت مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ۔ علمی شخصیت اور فکری بصیرت، مرتبہ سید احتشام احمد ندوی، فیض المصنّفین، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء [مقالہ از: شمامہ بلال، ابّا کے حالاتِ زندگی اور جامعہ سے ان کا تعلق] ص ۲۹۵۔ ''معارف'' کی نسبت سے ''دارالمصنّفین کے سو سال'' کے مصنفِ محترم کا یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ نے: ''دارالمصنّفین میں شریکِ ناظم اور نائب مدیرِ معارف کی حیثیت سے خدمات انجام دیں'' (کلیم صفات اصلاحی، دارالمصنّفین کے سو سال، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰۴)۔ صحیح بات یہ ہے کہ جس طرح وہ شریکِ ناظم رہے، اسی طرح شریکِ مرتب بھی رہے۔

۵۲۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۳۳

۵۳۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۸۸

۵۴۔ امان اللہ خاں شروانی، الحاج مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی، تہذیب الاخلاق (مشاہیر علی گڑھ نمبر۔ جلد اول)، ۲/۲۳، فروری ۲۰۱۳ء ص ۱۰۴، ۱۰۶

کے غدر سے متعلق ان کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے [۵۵]۔ سرسید کی تصانیف میں ان کی ایک بہت ہی قیمتی علمی یادگار ''آثار الصنادید'' کا حوالہ اس میں نہیں آسکا ہے۔ یہ کتاب، دلی کی تاریخی عمارتوں کے احوال کا بیش بہا مرقع ہے اور اس کا آخری حصہ دہلی کے اہلِ علم وفن، علماء و مشائخ، اطباء و حکماء اور ہنر مندوں کے تذکرے پر مشتمل ہے [۵۶]۔ مولانا عبدالاوّل جونپوریؒ (م: ۱۹۲۰ء) کی مطبوعہ تصانیف میں کسی کتاب کا نام مندرج نہیں ہے [۵۷]۔ ان کی ایک معروف تصنیف ''مفید المفتی'' ہے جو پہلی دفعہ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں آسی پریس، لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔ مولانا سید عبدالحی الحسنیؒ (م: ۱۹۲۳ء) کے تذکرے میں یہ ذکر کیا گیا ہے: ''ان کی دوسری کتاب ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون بھی اپنے موضوع پر منفرد ہے'' [۵۸]۔ یہ اصلاً ان کی مشہور عربی کتاب ''الثقافۃ الاسلامیۃ'' کا اردو ترجمہ ہے، اردو ترجمہ مولانا ابوالعرفان ندویؒ (م: ۱۹۸۸ء) نے انجام دیا۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں فاضل مترجم کے تذکرے میں ان کی اس علمی خدمت کا ذکر نہیں آسکا ہے [۵۹]۔ نواب علی حسن خاں ابن نواب صدیق حسن خاں (م: ۱۹۳۶ء) کی تصانیف میں ایک کتاب ''مآثر صدیقی'' کا ذکر ملتا ہے [۶۰]۔ اس کتاب کی نسبت سے یہ وضاحت مفید معلوم ہوتی ہے کہ یہ دراصل ان کے والدِ محترم (نواب صدیق حسن خاںؒ) کی سوانح عمری ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے اور پہلی بار مطبع نول کشور لکھنو سے ۱۹۲۵ء میں طبع ہوئی تھی [۶۱]۔ نواب علی حسن خاں کے تذکرے میں یہ بھی مذکور ہے کہ ''وہ اپنے ہم عصروں کا ایک تذکرہ ''مردم دیدہ'' کے نام سے مرتب کررہے تھے، اس میں ان لوگوں کا ذکر تھا جن سے وہ خود مل چکے تھے، جن سے ملاقاتیں رہیں'' [۶۲]۔ نواب صاحب کی حیات و خدمات کے دوسرے مآخذ میں اس تذکرے

۵۵۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۱۴۔۱۱۵

۵۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد انصار اللہ، آثار الصنادید، سہ ماہی فکر ونظر علی گڑھ، خصوصی شمارہ، سرسید نمبر، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۳۳۔۲۳۷

۵۷۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۴۷

۵۸۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۵۱

۵۹۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۲۔۱۳

۶۰۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۰۰

۶۱۔ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند/ اردو ترجمہ از محمد ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۵۱، حاشیہ [از مترجم] نمبر۔۱

۶۲۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۰۰

(مردم دیدہ) کا کہیں حوالہ نہیں ملتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ مکمل ہوکر اشاعت کے مرحلہ سے نہیں گذر سکا۔ اسی ضمن میں یہ اضافہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نواب صاحب کے تذکرہ کے فارسی عنوان (مردم دیدہ) کے اردو ترجمہ ''وہ لوگ جنھیں میں نے دیکھا'' کے نام سے اعظم گڑھ کے ایک نامور فرزند مولانا قاری ابوالحسن اعظمی صاحب (سابق صدر شعبۂ قراءت، دارالعلوم دیوبند) نے تذکرہ کی ایک ضخیم کتاب (مشتمل بر ۵۶۰ صفحات) تالیف کی ہے جو الحراء بک ڈپو، دیوبند سے تقریباً دو برس قبل شائع ہوئی ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ (م: ۱۹۵۰ء) کے تذکرے میں یہ تحریر کیا گیا ہے: ''تصنیف و تالیف کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، ان کے دو رسالے ''علماءِ سلف'' اور ''نابینا علماء'' ان کی یادگار ہیں''[۶۳]۔ مولانا شروانی کی بعض دیگر اہم کتب یہ ہیں: رسائلِ سیرت، سیرۃ الصدیق، استاذ العلماء (مولانا لطف اللہ علی گڈھی)، مقالاتِ شروانی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ (م: ۱۹۴۳ء) کی تصانیف کے ضمن میں ان کی مشہور کتاب ''بہشتی زیور'' کا ذکر نہیں آسکا ہے[۶۴]۔ نامور شاعر و ممتاز ادیب اقبال احمد سہیلؒ (م: ۱۹۵۵ء) کے تذکرے میں یہ تحریر ہے کہ ''انہوں نے سید سلیمان ندویؒ کی ''حیات شبلی'' سے قبل علامہ شبلی کی سوانح کا آغاز کیا تھا، مگر ناتمام رہ گئی''[۶۵]۔ یہاں یہ وضاحت باعثِ افادیت ہوگی کہ اقبال سہیل مرحوم نے ''سیرتِ شبلی'' کے نام سے مضمون لکھنا شروع کیا تھا جو دائرہ حمیدیہ (مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر) کے ترجمان ماہنامہ ''الاصلاح'' کے اکتوبر ۱۹۳۶ء سے فروری ۱۹۳۹ء تک کے شماروں میں بالاقساط (۱۵ قسطوں میں) شائع ہوئے تھے۔ اِن مضامین کا مجموعہ اسی نام سے کتابی صورت میں (بہ تصحیح و ترتیب: فضل الرحمٰن اصلاحی) ڈاکٹر احمد صفی انصاری (م: ۳۰/ جولائی ۲۰۲۳ء) کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۴ء میں معارف پریس، اعظم گڑھ سے اشاعت پذیر ہوا ہے۔ قاضی سجاد حسین بجنوریؒ (م: ۱۹۹۰ء) کی علمی خدمات میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ''انہوں نے فتاوای تاتارخانیہ کو ایڈٹ کر کے پانچ جلدوں میں شائع کر دیا''[۶۶]۔ اس مجموعہ فتاوی کی نسبت سے یہ وضاحت مفید معلوم ہوتی ہے کہ پروفیسر نورالحسن

۶۳۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۴۷

۶۴۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۳۴۔۳۵

۶۵۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۳۹

۶۶۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۱۰۷

صاحب مرحوم (سابق وزیرِ تعلیم) نے وزارتِ تعلیم کی جانب سے اس فتاویٰ کی تدوین وترتیب کی ذمہ داری قاضی سجاد صاحب مرحوم کو سپرد کی تھی اوران کی مرتبہ پانچ جلدیں وزارتِ تعلیم ،حکومتِ ہند کے مصارف پر دائرۃ المعارف العثمانیہ (حیدرآباد) سے ۱۹۸۴-۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی تھیں [۶۷]۔قاضی عدیل عباسیؒ (م:۱۹۸۰ء) کی مصنفہ کتب کے بارے میں یہ تحریر کیا گیا ہے: ''ان کی کئی کتابیں یادگار ہیں ، اقبال فلسفۂ حیات اور شاعری اور تحریکِ خلافت کی تاریخ'' [۶۸]۔موخرالذکر کتاب کا اصل نام ''تحریکِ خلافت'' ہے جو پہلی بار ترقی اردو بورڈ ، نئی دہلی سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔متعدد کتب کے مصنف پروفیسر اشتیاق حسین قریشی (م :۱۹۸۱ء) کے تذکرے میں نہ تو ان کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا ذکر ملتا ہے اور نہ ہی ان کی کسی کتاب کا نام مذکور ہے، [۶۹]۔ان کی علمی یادگاروں میں متعدد انگریزی کتب شامل ہیں جو زیادہ تر عہدِ اسلامی کے ہندوستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ان میں کچھ مشہور یہ ہیں: دِی ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف ڈلہی ، دی ایڈمنسٹریشن آف دی مُغل اِمپائر، اکبر۔دی آرکیٹکٹ آف دی مغل اِمپائر، مسلم کمیونٹی آف دی اِنڈو۔پاک سب کانٹینٹ ،علماء اِن پالیٹکس۔نامور عالمِ دین اور سابق ناظمِ دینیات مولانا محمد تقی امینیؒ (م:۱۹۹۱ء) ایک ممتاز صاحبِ قلم ومصنفِ کتبِ کثیرہ تھے،لیکن ان کے تذکرے میں ان کی کسی کتاب کا نام درج نہیں ہے [۷۰]۔مولانا مرحوم کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں: حکمۃ القرآن، حدیث کا درایتی معیار، فقہِ اسلامی کا تاریخی پس منظر، مسئلۂ اجتہاد پر تحقیقی نظر، احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، اسلام اور دورِ جدید کے مسائل، اسلام کا زرعی نظام، مذہب کی تشکیل جدید۔ [۷۱]

۶۷۔تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: ظفرالاسلام اصلاحی، فتاوای تاتارخانی۔ایک تعارفی مطالعہ،فکرونظر (علی گڑھ)، ۴۸/۴، دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۶۸-۸۲

۶۸۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ، ص ۱۹۴

۶۹۔تذکرہ مشاہیر ہند۔کاروانِ رفتہ، ص ۳۳-۳۴

۷۰۔ تذکرہ مشاہیر ہند۔کاروان رفتہ، ص ۶۴

۷۱۔مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: کنور محمد یوسف، مولانا محمد تقی امینی۔عالمی فقیہ اور مثالی مربی، تہذیب الاخلاق، مشاہیرِ علی گڑھ نمبر (جلد اول)، ۲/۳۲، فروری ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۹-۱۶۱

زیرِ مطالعہ کتاب میں مشاہیرِ ہند کے تذکرے الفبائی ترتیب کے مطابق مرتب کیے گئے ہیں۔بعض مقامات پر اس میں کچھ بے ترتیبی نظر آئی۔مثال کے طور پر جن مشاہیر کے نام میں پہلے ''محمد'' ہے اس کے بعد پھر نام کا دوسرا جزو/لفظ ہے ان میں سے متعدد شخصیات کے تذکرے میں الفبائی ترتیب میں دوسرے جزو/لفظ کی رعایت کی گئی ہے۔مثلاً محمد ابراہیم بلیاویؒ۲۷،اور محمد اُویس نگرامیؒ کے تذکرے (م کے بجائے) الف کے تحت مرتب کیے گئے ہیں۳۷۔ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیبؒ کا تذکرہ ''ط'' سے شروع ہونے والے ناموں کے ذیل میں ملتا ہے۴۷۔لفظ مبارک ''محمد'' سے شروع ہونے والے اسماءِ مشاہیر کے تذکرے کی ترتیب میں نام کے دوسرے جزو/لفظ کا لحاظ کرنے کی دیگر اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۵۷۔مزید یہ کہ (ص ۶۰) ''شاہ بدرالدین پھلواروی'' (م:۱۹۲۳ء) کا تذکرہ ہے اور اس سے قبل ''مولانا برکات احمد قاسمی'' (م:۱۹۷۹ء) کے احوال درج کیے گئے ہیں، جب کہ الفبائی ترتیب کے مطابق شاہ بدرالدین پھلواروی کا تذکرہ (ص ۵۷ پر) ''مولانا بدر عالم میرٹھی'' سے قبل ہونا چاہئے تھا۔اسی طرح ''مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ'' کا تذکرہ ''مولانا ابواللیث اصلاحیؒ'' کے بعد رکھا گیا ہے (ص ۱۱)، جب کہ الفبائی ترتیب کے اعتبار سے اول الذکر مرحوم کا تذکرہ ''مولانا ابوبکر شیث جونپوریؒ'' (ص ۸) سے پہلے آنا چاہئے تھا۔اسی طرح ''مولانا اسداللہ مئوی اور مولانا اسعداللہ رامپوریؒ'' کا تذکرے (ص ۳۱) ''مولانا اسلام الحق اعظمی'' کے بعد ملتا ہے اور ''مولانا عبدالحفیظ بلیاوی'' کا تذکرہ (ص ۱۵۸) ''مولانا عبدالحق'' کے تذکرے کے بعد رکھا گیا ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب میں نسبتاً طویل تذکرے (ایک صفحہ سے زائد یا تقریباً ایک صفحہ) درج ذیل حضرات کے ملتے ہیں: مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا عین القضاۃ لکھنویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا

۲۷۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص ۷

۳۷۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص ۵۴

۴۷۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص ۱۳۹

۵۷۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔کاروانِ رفتہ،ص ۸، ۱۸، ۲۸، ۳۲، ۴۱، ۴۷، ۵۰، ۵۵، ۶۱، ۶۴، ۱۰۴، ۱۱۲، ۱۱۵، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۳۸، ۱۹۴، ۲۰۷، ۲۱۴، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۶۸، ۲۷۰

ماہر القادریؒ، مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، قاضی عدیل عباسیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا عبیداللہ الپاٹلی سندھیؒ، مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ۔ دوسری جانب بہت سے حضرات کے تذکرے محض چند سطر، ایک دو سطر یا محض نصف سطر میں محدود ہیں جب کہ ان میں بیشتر اپنی دینی و علمی و ملّی خدمات یا تصانیف کی وجہ سے معروف و مشہور تھے۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر ان حضرات کے تذکرے ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں: امیر خسروؒ (م: ۱۳۲۴ء)، فریدالدین گنج شکر (م: ۱۲۶۵ء) شیخ محمد گیسودرازؒ (م: ۱۴۲۲ء)، شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ (م: ۱۵۳۷ء)، شیخ سلیم چشتیؒ (م: ۱۵۷۳ء)، خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۶۰۳ء)، شاہ عبدالرحیم دہلویؒ (م: ۱۷۱۸ء)، مرزا مظہر جان جاناں (م: ۱۷۸۱ء)، قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ (م ۱۸۱۰ء)، عبدالعلیم بحرالعلوم (م: ۱۸۱۰ء)، شاہ عبدالقادر دہلویؒ (م: ۱۸۱۵ء)، مولانا مملوک علی نانوتویؒ (م: ۱۸۵۰ء)، مولانا مظہر نانوتویؒ (م: ۱۸۸۵ء)، مولانا عنایت رسولؒ چریّا کوٹی (م: ۱۹۰۳ء)، مولانا الطاف حسین حالیؒ (م: ۱۹۱۴ء)، مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ (م: ۱۹۲۱ء)، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ (م: ۱۹۳۴ء)، مولانا احسن مارہرویؒ (م ۱۹۴۰ء)، مولانا حبیب الرحمٰن شروانیؒ (م: ۱۹۵۰ء)، عبداللہ یوسف علیؒ (م: ۱۹۵۳ء)، شاہ عبد القادر رائے پوریؒ (م: ۱۹۶۲ء)، مولانا احمد علی لاہوریؒ (م: ۱۹۶۲ء)، مولانا عبد العزیز میمنؒ (م: ۱۹۷۸ء)۔[۷۶]

مختصر یہ کہ زیرِ بحث موضوع کی زمانی وسعت (عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان، برطانوی دورحکومت اور دورِ مابعد آزادیِ ہند)، بیشتر مشاہیر سے متعلق بنیادی وضروری معلومات کی فراہمی، مشاہیرِ ہند کے سوانحی حالات کے ساتھ دینی و علمی، ملی وملکی خدمات کے اہم پہلوؤں کی وضاحت، مقام وتاریخِ ولادت ووفات کے ذکر میں ہجری وعیسوی سنین کے اندراج کا اہتمام، عام فہم زبان اور آسان اسلوب میں جمع کردہ مواد کی ترتیب و تدوین کے اعتبار سے پیشِ نظر کتاب بڑی خصوصیات کی حامل ہے اور انہی خصوصیات کی وجہ سے (مذکورہ بالا تسامحات وفروگذاشتوں کے باوجود) اس کی اہمیت وافادیت مسلّم ہے۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ کوئی انسانی کاوش کمی، خامی، غلطی اور

۷۶۔ تذکرہ مشاہیرِ ہند۔ کاروانِ رفتہ، ص ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۴۲، ۴۸، ۵۷، ۶۶، ۷۴، ۱۱۱، ۱۶۲، ۱۶۸، ۱۷۲، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۸۱، ۲۰۱، ۲۱۰، ۲۲۵، ۲۴۳، ۲۴۶ [بالترتیب]۔

تسامحات سے پاک نہیں ہوسکتی، انہیں دور کرکے اسے خوب سے خوب تر بنانے کے امکانات ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ اس کتاب کی نسبت سے راقمِ عاجز یہ توقع رکھتا ہے کہ مصنفِ محترم مرحوم کے گھر والوں یا قریبی رفقاء میں سے جو بھی اس مفید کتاب کی جدید اشاعت کے اہتمام کا قصد رکھتے ہیں وہ اپنے نیک ارادہ کو پورا کرتے وقت اس کتاب کے مشتملات سے متعلق معروضاتِ بالا کو پیشِ نظر رکھیں گے، تاکہ قارئین کے لیے یہ وقیع تالیف مزید افادیت کی باعث بنے۔

معارف دسمبر ۲۰۲۳ء کے ص ۶۴ سطر سات پر مسجد الحی کی جگہ محلّہ کی مسجد اور اسی صفحہ میں ابوالدجاء کی جگہ ابوالنجا پڑھا جائے۔ اور ص ۴۷ کی آخری سطر میں تیرگی کی جگہ برجستگی۔

بیاض شبلی یا بیاض محمد عمر

(نوادر شبلی کے حوالے سے)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

موبائل نمبر:+919838573645

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) ایک عرصہ تک بیاض کا اہتمام کرتے رہے۔ان کے ابتدائی دور کا فارسی کلام جس بیاض میں تھا وہ غازی پور میں ایک جلد ساز کے یہاں سے غائب ہوگئی تھی۔مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) نے لکھا ہے کہ:

> ان کے کلام کا ابتدائی حصہ ایک بیاض میں جمع تھا۔مولانا نے غازی پور میں ایک جلدساز کو وہ بیاض جلد باندھنے کو دی تھی اور وہ وہاں سے غائب ہوگئی۔لوگوں کو غازی پور کے ایک نوجوان فارسی شاعر ابوالقاسم عرشی مرحوم پر شبہ تھا جو بعد کو حیدرآباد میں شعرا کے سلسلہ میں منسلک ہوگئے تھے اور جوانی ہی میں وفات پائی۔لوگ کہتے تھے کہ وہ انہی نظموں کو حیدرآباد میں اپنے نام سے سناتے پھرتے تھے۔(حیات شبلی ص۲۵۵-۲۵۶)

یہی حادثہ علی گڑھ میں ۱۸۸۷ء میں دوبارہ پیش آیا اور علامہ شبلی کی بیاض کے آدھے حصہ پر کسی نے ہاتھ صاف کیا (ماخذ سابق)۔اگر یہ تمام کلام شبلی محفوظ رہا ہوتا تو غالباً ان کے دیوان میں اور تنوع ہوتا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنّفین کے قیام کے بعد جب علامہ شبلی کے غیر مطبوعہ اور غیر مدون کتب ومقالات، مکاتیب اور کلام مرتب کر کے شائع کرنا چاہا تو علامہ شبلی کے احباب و متعلقین اور ان کے تلامذہ سے رابطہ قائم کیا اور ان سے علامہ شبلی کے نوادرات فراہم کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ اس وقت اور نوادرات کے سوا انہیں دو بیاضیں بھی دستیاب ہوئیں۔ایک بیاض مولوی محمد سمیع صاحب موضع کنورہ گھنی ضلع اعظم گڑھ نے پیش کی اور دوسری بیاض مولوی محمد عمر صاحب موضع بینا پارہ ضلع اعظم گڑھ نے فراہم کی۔مولوی محمد سمیع کی بیاض نسبتاً ضخیم تھی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اس سے نہ صرف کلام شبلی بلکہ متعدد مکاتیب بھی مکاتیب شبلی اول و دوم اور کلیات شبلی اردو و فارسی میں نقل

کئے ۔ یہ بیاض کتب خانہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں عرصہ تک محفوظ تھی، مگراب دستیاب نہیں۔غالباًاس پربھی کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھلائی۔

البتہ دوسری ''بیاض شبلی'' جسے مولوی محمد عمر صاحب نے مولانا سید سلیمان ندوی کوفراہم کی تھی وہ دارالمصنّفین کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہےاوراچھی حالت میں ہے،لیکن اسے بیاض شبلی کہنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ اس کومولانا سید سلیمان ندوی کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مولوی محمد عمر مرحوم نے سرورق پر یہ خط لکھا ہے کہ:

السلام علیکم

جو کچھ کلام استادی مرحوم دستیاب ہوسکاارسال خدمت ہے۔اس میں اورلوگوں کا کلام بھی درج ہےمگر مولانا (شبلی) کا جو کچھ کلام شامل ہے (اس کے سامنے) مولانا کا نام شبلی نعمانی درج کردیا ہےاور کچھ نقل خطوط بھی ہیں۔بعدنقل ازلطف کریمانہ واپس فرمایئے گا۔

زیادہ سلام علیکم

احقر محمد عمر۔از بینا پارہ

۱۵ ؍فروری ۱۹۱۵ء

مولوی محمد عمر صاحب کےاس خط سے واضح ہے کہ یہ علامہ شبلی کی نہیں بلکہ یہ مولوی محمد عمر کی بیاض ہے۔مولوی محمد عمر صاحب موضع بینا پارہ ضلع اعظم گڑھ کے باشندہ اور علامہ شبلی کے ابتدائی دور کے شاگرد تھے(مکاتیب شبلی ۲؍۲۱۲)۔

اس بیاض میں علامہ شبلی نعمانی کے نام کے ساتھ جوالقاب وآداب لکھے ہوئے ہیں وہ بھی شہادت دیتے ہیں کہ یہ بیاض شبلی نہیں ہے،اس لئے کہ علامہ شبلی خوداپنی تحسین میں ایسے الفاظ اپنے قلم سے کیوں کرلکھ سکتے تھے؟

مولوی محمد عمر صاحب کی اس بیاض میں علامہ شبلی کے مکاتیب اوراشعار کےعلاوہ اردو کے نامورشاعرحکیم مومن خاں مومن ،انشاء اللہ خاں انشؔا اور بعض دوسرے شعرا کا کلام بھی شامل ہے۔اس بیاض کے نقل کرنے والے بھی مختلف ہیں۔ان میں مولوی محمد سمیع (موضع کنورہ گھنی) مولوی محمد فصیح اللہ (موضع بندول) مولوی احمد اللہ (موضع بندول) اورمولوی محمد عمر (موضع بینا پارہ) وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

چونکہ اس بیاض کا بنیادی تعلق علامہ شبلی کی ذات گرامی سے ہے اوراس کے مشمولات کا غالب حصہ انہی کے مکاتیب اور کلام پر مشتمل ہے اورانہی کی نسبت سے جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی خدمت میں اسے پیش کیا گیا ہے۔اس لئے شبلیات کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ وتعارف یقیناً افادیت کا حامل ہوگا۔

مولوی محمد عمر صاحب کی اس بیاض کا آغاز ایک اردو نظم سے ہوا ہے جس کا کوئی عنوان نہیں ہے۔ البتہ اس کے آغاز میں یہ تحریر ہے کہ ''ریختہ قلم جادورقم مولوی محمد سمیع صاحب ساکن اعظم گڑھ''۔لیکن اس کے سامنے کسی نے باریک قلم سے ''درحقیقت شبلی نعمانی'' بھی لکھ دیا ہے۔ظاہر ہے یہ ''درحقیقت شبلی نعمانی'' صاحب بیاض مولوی محمد عمر نے لکھا ہوگا ،جیسا کہ انہوں نے سرورق پر اپنے مکتوب میں تصریح کی ہے،لیکن یہ نظم کلیات شبلی فارسی میں شامل نہیں ہے۔یقین ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے تحقیق کے بعداس سے صرف نظر کیا ہوگا۔

اس نظم کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مولوی محمد سمیع ہی کی تخلیق ہے۔اس لئے کہ اس کی صاف صراحت موجود ہے۔دوسرے نظم کی بعض اندرونی شہادتیں بھی اس کے حق میں ہیں۔

علامہ شبلی نے چند سال بعد جب مثنوی ''صبح امید'' (مطبوعہ:۱۸۸۷ء)لکھی تو قریب قریب یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔اس سے بعض محققین کوشبہ ہوسکتا ہے،مگراس میں وہ پر پرواز اور وہ تخیل نہیں ہے جواس دور میں علامہ شبلی کے کلام میں پایا جاتا ہے اور جس کی بنیاد پرممتاز نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد(۱۹۰۸ - ۱۹۸۳ء)نے'' صبح امید'' کی تحسین وستائش کی ہے اور اسے اس عہد کی بعض مشہور مثنویوں پر اعلانیہ ترجیح دی ہے۔بہرحال قطعی طور پرنہیں معلوم کہ کس کا کلام ہے۔اس لئے اس نظم کو یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوا کہ اہل علم اس کا تصفیہ کرسکیں مگر ہماری ناقص رائے اب بھی یہی ہے کہ یہ مولوی محمد سمیع کی تخلیق ہے۔

۱	احباب کو یہ صدا مبارک	یہ مژدۂ جاں فزا مبارک
۲	اس مردم چشم مردمی نے	یعنی حافظ حسن علی نے
۳	وہ نامہ لا جواب لکھا	عالم میں نہیں نظیر جس کا
۴	جو مسئلہ ہے وہ مستند ہے	ہر لفظ سپند چشم بد ہے

۵	اس نامہ نو کا طرز اسلوب	از بسکہ ہے دل پسند و مرغوب
۶	پر حق میں عدو کی اے دل افروز	ہر سطر ہے ناوک جگر دوز
۷	ہر چند کہ نزد صاحب فن	ہر حرف ہے اک دلیل روشن
۸	تصویر یقیں جو ہے تو یہ ہے	شمع رہ دین جو ہے تو یہ ہے
۹	کچھ ایک عدو نہیں خجل ہے	حاسد بھی حسد سے منفعل ہے
۱۰	کس طرح سے دیکھ اے معاند	باطل ہوئی تیری رائے فاسد
۱۱	اب سے بھی اگر بجوش مستی	ہو تجھ کو خیال خود پرستی
۱۲	میدان سخن وسیع تر ہے	دکھلا ترے پاس جو ہنر ہے
۱۳	اوروں سے بھی یاوری طلب کر	کر جمع اساتذہ کو یکسر
۱۴	پھر دیکھ کہ کس طرح بلا کد	کرتا ہوں ترے خیال کو رد
۱۵	کیا یاد کرے عدو یہ تو بھی	ہاں کی تھی کسی سے گفتگو بھی
۱۶	انصار بھی ترے وقت پیکار	کھولیں نہ کبھی زبان گفتار
۱۷	اکنوں بامید دست گیری	**ادعو من حضرة القدیری**
۱۸	**ان یعصمنی من الدواھی**	**و الامر الیک یا الٰھی**

ناچیز راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ اگر علامہ شبلی کی کوئی تخلیق مولانا سید سلیمان ندوی کی نگاہ سے گذرتی تو وہ اپنے استاد کی عقیدت بے پایاں کی بنا پر اسے صرف نظر نہیں کر سکتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ کلیات شبلی فارسی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی میں علامہ شبلی کا متعدد فارسی کلام شامل نہیں کیا گیا ہے، مگر ان دونوں باتوں کی نوعیتیں جدا جدا ہیں۔ علامہ شبلی کے ابتدائی دور کا فارسی کلام مولانا سید سلیمان ندوی کی نظر سے نہیں گذرا یا ان کی دسترس میں نہیں آیا ہوگا مگر مولوی محمد عمر کی یہ بیاض جسے ''بیاض شبلی'' کا نام دیا گیا ہے، ان کی نظر سے یقیناً گذری تھی۔ مولوی محمد عمر نے اسے انہی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ نیز متعدد اردو و فارسی کلام شبلی انہوں نے علی الترتیب دونوں کلیات اردو و فارسی میں اس بیاض سے نقل بھی کیا ہے۔ راقم کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ کاتب کی سہل انگاری کا بھی معاملہ ہوسکتا ہے۔

اس بیاض میں دوسری تخلیق چند فارسی اشعار ہیں۔ یہ کس شاعر کے ہیں اس کی صراحت نہیں کی گئی

ہے۔ یہ 'کلیات شبلی' فارسی میں بھی شامل نہیں ہیں۔ایک شعر کے سامنے نجم الدین چریا کوٹی لکھا ہوا ہے۔گویا اس بیاض میں ان کے اشعار بھی شامل ہیں۔

مولانا نجم الدین عباسی چریا کوٹی قصبہ چریا کوٹ کے نامور عالم اور اپنے عہد کے ممتاز شاعر و ادیب اور مصنف و مولف تھے۔ان کی مثنویاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اور خانوادۂ شبلی کے علاوہ ان کے متعلقین اور تلامذہ بھی چریا کوٹ کے اہل علم اور ارباب کمال سے ربط ضبط رکھتے تھے۔مولانا ابوالجلال ندوی کے تذکرہ میں یہ بات خود انہوں نے لکھی ہے کہ علامہ شبلی انہیں گھر کا لڑکا کہا کرتے تھے۔

ان متفرق اشعار کو تحفظ اور مطالعہ و تحقیق کی غرض سے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ممکن ہے کوئی محقق ان اشعار کے خالق کی نشاندہی کردے۔

دو لشکر بنا و رد برخاستند — دو صف چون صف محشر آراستند

چناں تنگ شد عرصہ بر پردلان — کہ شد تیغ در قبضہ خود نہان

قیامت زشمشیر بالا گرفت — زگرز گراں کوہ صحرا گرفت

چناں لرزہ در دشت کین اوفتاد — کہ قارون برون از زمین اوفتاد

کشید از میان تیغ زہر آب گوں — چوں ماری کہ از شلہ آید بروں

چناں تنگ شد عرصہ رزم گاہ — کہ از دیدہ بیروں نہ رفتے نگاہ

نجم الدین چریا کوٹی

علم بر زعیوق برتر کشید — سنان چشم سیارہ بر سر کشید

زسم ستوران وران رزم گاہ — عیان گشت ماہی نہاں گشت ماہ

در آمیختہ لشکر ہردو صف — چوں در حالت پنجہ گیری دو کف

تیسری تخلیق نوید شادی مولوی محمد عمر ہے۔یہ علامہ شبلی کی کاوش ہے اور کلیات شبلی فارسی میں شامل ہے۔اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مولوی محمد عمر کے نکاح کی تاریخ ۵/ذی الحج ۱۲۹۳ھ بروز جمعہ مقرر ہوئی تھی۔

اس کے بعد کی تخلیق اس مثنوی کے تین اشعار ہیں جو علامہ شبلی نے ۱۸۷۶ء کے اپنے سفر حج کے

موقع پر جوانہوں نے اپنے والدین کے ساتھ کیا تھا، روضہ اطہر پر پڑھے تھے۔ان اشعار کو مولانا سلیمان ندوی نے کلیات شبلی فارسی (ص ۹۹) اور حیات شبلی (ص ۱۵۰) میں نقل کیا ہے۔

پانچویں تخلیق علامہ شبلی کے تین اشعار ہیں۔ظاہر ہے اسے نامکمل ہی کہا جائے گا۔ کلیات شبلی فارسی میں یہ شامل نہیں ہیں۔یہ اشعار درج ذیل ہیں:

ساقیا باز خیز وساغر دہ   جام مئے دہ ومکرر دہ
فصل گل آید و بہار رسید   مئے بدہ کا نیکم خوار رسید
چوں سرمدہ دوستانم ہست   بادہ دردہ کہ بارہ جانم ہست

ساتویں تخلیق بھی ایک غزل ہے جو پانچ اشعار کی ہے اور کلیات میں شامل ہے، جس کا مقطع یہ ہے:

ازبس بیاد آں قد رعنا گریستم
بیخود بزیر سایہ طوبیٰ گریستم

اس کے بعد کی تخلیق بھی ایک غزل ہی ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ 'غزل شبلی نعمانی'۔باوجود اس کے کلیات میں شامل نہیں ہے۔غزل درج ذیل ہے:

از جہان خاطر پریشاں می روم   ہم چو بلبل از گلستاں می روم
در سفر داریم آتش زیر پا   ہم چو دود شمع پیچاں می روم
دوستاں راہست شادی وطرب   ما زبخت خود پریشاں می روم
آتشی داریم در سینہ نہاں   از شرارش سینہ سوزاں می روم
طالع و اژوں مرا یاری نکرد   چوں سکندر زآب حیواں می روم

کشید از میان تیغ زہر آب گوں
چو ماری کہ از شلہ آید بروں

اس فارسی غزل کے بعد علامہ شبلی کے ابتدائی دور کے فارسی کے ۷؍مکاتیب شامل ہیں۔درمیان میں ایک تقریظ ہے جو مولوی محمد احمد اللہ صاحب موضع بندول ضلع اعظم گڑھ کے قلم سے ہے۔مذکورہ مکتوبات شبلی میں ۵؍مکتوبات مولوی محمد عمر بینا پارہ کے نام ہیں۔جبکہ ایک ایک مکتوب علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ اور مولوی محمد سمیع کے نام ہیں۔شیخ حبیب اللہ کے نام خط اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ

اس میں ناموراديب مولانا فیض الحسن سہارن پوری (۱۸۱۶-۱۸۸۷ء) سے تحصیل کے لئے علامہ شبلی نے لاہور کا جو سفر کیا تھا اس کے اخراجات کی تفصیل درج ہے۔ یہ تمام خطوط، مکاتیب شبلی حصہ دوم میں فارسی مکاتیب کے ضمن میں نقل ہوئے ہیں اور ڈاکٹر خالد ندیم صاحب نے مکاتیب شبلی کا جو اردو ترجمہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے شائع کرایا ہے اس میں بھی ان مکاتیب کے تراجم شامل ہیں۔

مکاتیب شبلی کے دونوں حصوں کی ترتیب وتدوین مولانا سید سلیمان ندوی جانشین شبلی نے کی ہے۔ بیاض شبلی یا کلام ومکاتیب اور دیگر تخلیقات شبلی فراہم کرنے والے مولوی محمد سمیع (ملازم محافظ دفتر جون پور) اور مولوی محمد عمر، دارالمصنّفین کے عہد سلیمانی میں حیات تھے مگر علامہ شبلی سے انتہائی گہرے تعلق کے باوجود ماہنامہ معارف میں ان کا کہیں ذکر مجھے نہیں ملا۔ حتیٰ کہ ان دونوں کی وفیات بھی کسی اہل قلم نے معارف میں نہیں لکھی ہے۔ اس بے اعتنائی کی وجہ معلوم نہیں۔ اسی طرح عبدالحکیم اعظمی جو علامہ شبلی کے ہم وطن اور بندول کے رہنے والے تھے اور جو شبلی منزل میں مقیم اور سیرۃ النبی کے مسودہ نویس تھے۔ علامہ شبلی نے سیرت کا مسودہ انہی سے مقفل کرا کے یہ وصیت کی تھی کہ یہ فلاں فلاں کے علاوہ کسی کو نہ دیا جائے۔

۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کی وفات پر ان کے اعزہ کو جو تعزیتی پیغامات موصول ہوئے ان کے جواب میں ۱۳/دسمبر ۱۹۱۴ء کے زمیندار لاہور میں عبدالحکیم اعظمی کا مراسلہ شائع ہوا ہے۔ وہ مراسلہ ناچیز کی کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' میں شامل ہے۔ عبدالحکیم اعظمی کا بھی کہیں کچھ ذکر نہیں ملتا ہے۔ یہاں یہ دلچسپ بات بھی لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ یہی عبدالحکیم اعظمی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اعظمی لکھنا شروع کیا۔

مکاتیب شبلی اور تلامذہ شبلی میں مولوی محمد عمر نام کے دو اشخاص کا نام شامل ہے۔ مکاتیب شبلی حصہ اول میں حکیم محمد عمر کے حاشیہ میں ان کی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

> مولانا (شبلی) کے ہم تعلیم وہم صحبت اور عہد شباب کے دوست، اعظم گڑھ میں محافظ دفتر ہیں اور نیز مطب کرتے ہیں۔ مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی ہے۔ (مکاتیب شبلی: ۲/۵۴)

مکاتیب شبلی کے دوسرے حصہ میں یہ دونوں ہم نام مکتوب الیہ کے نام مکتوبات شامل ہیں۔ اس بیاض

عمر سے معلوم ہوا کہ مولوی محمد عمر بینا پارہ کے تین مکاتیب مولوی حکیم محمد عمر کے نام درج ہو گئے ہیں اور مکاتیب شبلی حصہ اول میں سہواً مولوی محمد عمر کے نام کے ساتھ حکیم لکھ گیا ہے۔

مولوی محمد سمیع موضع کنورہ گھنی کے نام علامہ شبلی کا جو فارسی مکتوب بیاض عمر میں شامل ہے وہ مکاتیب شبلی حصہ دوم میں درج ہے۔ بیاض میں اس اندراج کے بعد مولوی محمد احمد اللہ بندولی کی تقریظ ہے۔ جو یہ ہے:

تقریظ چکیدہ خامہ فاضل بے بدل

مولوی محمد احمد اللہ صاحب ضلع اعظم گڑھ، موضع بندول

برنکتہ دانان ہنر پرور پوشیدہ و مستتر نیست کہ چوں دریں دہر پر آشوب در جمیعت اسلام تفرق و پریشانی رونمود۔ ہریک از اعداے دین درہوائے خردہ گیری بال پرواز ہمت کشود۔ گروہی از ملحدان غوی دست تطاول بسوے کیش نبوی دراز کردند۔ و پارۂ از نجدیان لیام لب بہ نفریں ائمہ کرام باز کردند۔ گاہے خارے گشتند و بدامن ارباب کمال درآویختند و وقتے غبارے شدندو در دیدۂ اہل بینش و حال ریختند۔ چوں کار فتنہ بالا گرفت حامی دین مصطفوی مولوی محمد نصیر الحق صاحب ساکن بندول ضلع اعظم گڑھ دام فیضہ کمر ہمت چست بست۔ واز بہر استیصال ایں ناہنجیردان سر آستین سعی و محنت ببالا شکست۔ دراندک زمانے ایں عجالہ نافعہ برروی کار آورد وہمت بر وایشاں گماشت و در ہر بحثی از عہدۂ تفصیل و تدقیق بدر آمدہ خاک در دیدۂ دشمناں انباشت ہر نقطہ اش گلی شد و در چشم ایشاں افتاد۔ و ہر سطرش سنانی گشت و در دیدہ بی این بصران سوراخ نہاد، ۱۲۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء.۱۲　　راقم

محمد فصیح اللہ

۱۴/۱۰/اکتوبر ۱۸۸۲ء

مولوی محمد احمد اللہ کی تقریظ کے بعد وہ قصیدہ درج ہے جو علامہ شبلی نے سلطان عبدالحمید خاں کی مدح میں لکھا ہے۔ یہ قصیدہ نصف اردو اور نصف فارسی میں ہے اور دونوں حصہ کلیات اردو و فارسی میں شامل ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

پھر بہار آئی ہے شاداب ہے پھر دشت چمن
بن گیا رشک گلستان ارم پھر گلشن

اس کے بعد ابتدائی دور کی ایک طویل فارسی نعت ہے جسے کلیات فارسی میں عہد شباب کی تخلیقات میں مولانا سید سلیمان ندوی نے نقل کیا ہے (کلیات فارسی، ص ۹۵، طبع جدید ۲۰۰۵ء)۔

بعدازاں ''رزمیہ کابل وقندھار'' ہے۔ اسے مولانا سید سلیمان ندوی نے پہلے دور یعنی علامہ شبلی کے آغاز شاعری سے ۱۸۸۲ء تک کی تخلیقات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

اسی زمانہ کی یادگار ان کی ایک لمبی نظم ہے۔ کسی انگریز شاعر نے انگریزی میں قندھار اور کابل کی لڑائی کا حال نظم کیا تھا، جس میں اس فوج کے انگریز افسر کی تعریفیں ہیں۔ ان میں سے کوئی انگریز بدل کر اعظم گڑھ آیا تھا۔ اس کی فرمائش سے اس کی انگریزی نظم کا اردو میں ترجمہ فرمایا۔...... یہ ویسی ہی نظم ہے جیسی ایک فرمائشی نظم ہونی چاہئے۔ (کلیات شبلی اردو، ص:۸)

غالباً فرمائشی نظم خیال کر کے مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے کلیات شبلی میں نقل نہیں کیا ہے۔ البتہ اصل انگریزی نظم اگر دستیاب ہوجاتی تو اس ترجمہ کا جائزہ زیادہ مناسب اور زیادہ موزوں ہوتا، تاہم یہ بجائے خود ایک بڑی اہم بات ہے کہ علامہ شبلی نے انگریزی نظم کا منظوم اردو ترجمہ پہلے دور شاعری یعنی ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستہ ہونے سے پہلے کیا ہے۔

اس تخلیق پر اب ایک زمانہ گذر چکا ہے۔ اگر مولوی محمد عمر کی یہ بیاض ضائع ہوجائے تو علامہ شبلی کے عہد شباب کی یہ یادگار مٹ جائے گی۔ اس لئے تحفظ کے خیال سے یہ نظم یہاں نقل کی جاتی ہے:

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں — رایت وطبل ونشاں کی داستاں
پہلوانان جہاں کی داستاں — شاہ کے اعزاز وشاں کی داستاں

حکمران بحر وکان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے

والی کابل نے کی جب سرکشی — ملک میں اپنے سفارت منع کی
غیر سے ڈالا تھا طرح آشتی — ہو چلا تھا کچھ خیال خودسری

روس پر تھا جو گمان اختیار

ہاتھ سے چھوٹی عنان اختیار

تب ہوا حکم شہنشاہ زماں اس کے سرکوبی کو ہوں فوجیں رواں
سنتے ہی فرمان دارائے جہاں ہو گئی آراستہ فوج گراں

فوج وہ حکم قضا کہیے جسے
ایک سیلاب بلا کہیے جسے

بڑھ چلے سرحد افغان کی طرف جنگ کی خواہش میں ہر ایک بکف (کذا)
یوں رواں تھے دستہ دستہ صف بصف تیر جائے جس طرح سوئے ہدف

صدمہ لشکر سے ہامون ہل گیا
وہ پڑی ہل چل کہ گردون ہل گیا

تھا رسالہ آٹھواں بنگال کا ساتھ جس کے ہم ہوے تھے رہ گرا
دل میں اعدا کا ذرا بھی ڈر نہ تھا تیز تر جاتی تھی جوں باد صبا

کس کی طاقت تھی کہ ہم کو روکتا
ضربت تیغ دو دم کو روکتا

اس طرح سے با کمال اقتدار کر گئی سرحد افغاں سے گذار
نعرۂ شادی کرو اب تین بار از برائے ملکۂ عالی تبار

حکمران بحر و کان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے

فوج جس کے ساتھ ہم تھے رہ گرا وہ رسالہ جنرل بیس کا تھا
ہے یہ وہ جنرل کہ زہرہ خصم کا ڈر سے اس کی آب رہتا ہے سدا

وہ شجاعت میں نہیں رکھتا نظیر
ہے دلیری میں وہ آپ اپنا نظیر

اس رسالہ کا نگہباں ہے وہی فوج کی عزت کا ساماں ہے وہی
موجب ہر عزت و شان ہے وہی رزم کا شیر نیستان ہے وہی

ہے بلند اتنا جو پایا فوج کا
مرتبہ اس نے بڑھایا فوج کا

تین سو تھے ساتھ لشکر کے سوار تھی ہر ایک کو آرزوے کارزار
لب پہ جاری تھی صداے گیر و دار فوج افغاں سے ہوے پھر آشکار
کوس حربی بج گیا لشکر چلا
شیر کی صورت ہر ایک افسر چلا

دونوں لشکر جب مقابل آ گیا جوہر اپنا ہر جری دکھلا گیا
کوئی دشمن پر قیامت لا گیا گولیوں کا مینہ کوئی برسا گیا
دشمنوں کے لب پہ تھا نام اجل
تیغ کہہ جاتی تھی پیغام اجل

رن میں بندوقیں جو چھوٹیں ایک بار ہو گیا سامان محشر آشکار
مردہ صد سالہ جی اٹھے ہزار کانپ اٹھا جسم فلک ہے رعشہ دار
عیش برہم ہو گیا ناہید کا
رنگ فق تھا چہرہ خورشید کا

توپیں وہ گرجیں کہ خالق کی پناہ جان کو تھی بھاگنے کی بھی نہ راہ
کوہ اڑتے تھے برنگ برگ کاہ آب ہوتا زہرہ شیر سیاہ
توپ وہ گرجی کہ دریا پھٹ گیا
شیر گردوں کا کلیجہ پھٹ گیا

الغرض ہم کو ہوئی فتح آشکار فوج نے دشمن کی لی راہ فرار
نعرہ شادی کرو اب چند بار از براے افسر گردوں وقار
میر و منصور و مظفر حال میں
وہ سپہ دار دلاور چال میں

غلغلہ ہے فتح کا ہر چار سو تیغ بھی میداں سے آئی سرخرو

ہو گئی پامال سب فوج عدو اب یہی ہر بزم میں ہے گفتگو

حکمران بحر و کان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے

یہ سواران دلاور نامدار ہشتدہ نمبر کے پہلے تھے سوار
جب ہوئے افواج شاہی میں شمار آٹھویں نمبر کا پایا اعتبار

طالع فیروز تھا اپنا بلند
آسماں سے ہو گیا پایا بلند

جان نثاروں کی جو عزت شہ نے کی کیوں نہ ہو بے انتہا ان کو خوشی
نعرۂ شادی بلطف و خرمی کیجیے اب بہر میجر لنڈسی

وہ جو اپنی قوم پر جان دادہ ہیں
وہ جو اچھوں کے لئے شہزادہ ہیں

وہ سپہ دار دلاور فتح یاب جو شجاعت میں نہیں رکھتا جواب
جس سے ہے دل میں عدو کے پیچ و تاب تیغ جس کی ہے کلید فتح باب

حکمران بحر و کان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے

سندھ سے پھرتا چمن بے خوف و باک راہ کو کرتے گئے ہم صاف پاک
وہ ہوا گرم اور زمین تابناک برف کا وہ زور وہ صحرا کا خاک

روک ہم کو ایک بھی سکتا نہ تھا
خوف دشمن سے ہمیں اصلا نہ تھا

تین نعرے بہر آں عالی مقام یعنی ہے یک سل صاحب جس کا نام
کھانے کا پینے کا یوں ہر صبح و شام وہ نہ ہوتے تو نہ ہوتا انتظام

حکمران بحر و کان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے

پھر کیا ہم نے روانہ بے خطر ڈاک اور اسباب و مال و گنج وزر
تب کہا جوش طرب میں آن کر صاحب جنرل نے یوں با کروفر
یعنی جتنے یاں ہیں اہل فوج سب
وہ کریں ان کی حفاظت روز وشب
نعرۂ شادی کرو اب بے خطر بہر کپتان ملکی صاحب ہنر
جو رسد کو فوج میں بے خوف و ڈر جمع رکھتے ہیں مقام صدر پر
حکمران بحر و کان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے
قطع سے آگے کیا ہم نے سفر یعنی اسی میل سے بھی بیشتر
جتنے گھوڑے تھے کسی کی پشت پر زخم کا ہرگز نہ تھا کچھ بھی اثر
اس طرح کوئی گذر سکتا نہیں
دوسرا یہ کام کر سکتا نہیں
نعرہ شادی کرو اب چند بار از برائے افسر گردوں وقار
وہ ڈیکیورس مینڈ صاحب نامدار سب پڑاؤں پر تھا جن کا اختیار
حکمران بحر و کان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے
جب کہ پہونچے ہم بریر کوہسار شہر شیں میں بجاہ و اقتدار
دھوپ تھی ہر چند واں پر شعلہ بار اور تھا ہر ایک طپش سے بے قرار
پر نہ تھا ہم کو تعجب کچھ وہاں
کامیابی سے ہوئے آگے رواں
نعرۂ شادی میں اب کیجئے نہ دیر واسطے اس کے جو ہے ہمتائے شیر
وہ اجٹن پارسن مرد دلیر پہلوانوں کو کیا ہے جس نے زیر
حکمران بحر و کان کی فتح ہے

قیصر ہندوستان کی فتح ہے

پھر بڑھے آگے بجاہ و اقتدار راہ تھی لیکن پر از گرد و غبار

ہو گئی تھی سب ہوا تاریک و تار دیکھ پڑتا تھا نہ کچھ بھی زینہار

اڑتی تھی ہر چارسو صحرا کی خاک

باد صرصر چل رہی تھی خوفناک

جب کہ پہنچے ہم وہاں بے خوف وباک دامن کہسار رکھا صاف و پاک

کر دیا تھا صاف یکسر روئے خاک شورش لشکر سے اعدا تھے ہلاک

اب برائے شہسوار ارجمند

ہو صدائے نعرۂ شادی بلند

وہ فرنڈ پالک بہادر مرد کار جو دلیری میں ہے فرد روزگار

جس نے تیغ تیز سے لی اضطرار ایک بڑے سور کو مارا وقت شکار

حکمران بحر و کان کی فتح ہے

قیصر ہندوستان کی فتح ہے

پھر کیا ہم نے پس از جنگ دگر ایک تکلف کی سلامی بے خطر

کیوں کہ حکم جنرل عالی گہر تھا کہ اب قندھار کو کیجئے سفر

نعرۂ شادی کرو اب تین بار

بہر سرداران فوج نامدار

وہ سواران دلاور نیک نام فتح و نصرت جن کا ادنی سا ہے کام

غلغلہ جن کا کہ ہے تا روم و شام جانتے ہو تم بخوبی جن کے نام

حکمران بحر و کان کی فتح ہے

قیصر ہندوستان کی فتح ہے

پر نہیں زیبا ہے ہم کو زینہار گھر کے جانے کا تمھیں دیں اختیار

کیوں کہ واجب ہے کہ اب ہر مرد کار جنگ میں حاصل کرے عزو وقار

تم بھی جاؤ سروری حاصل کرو
عزت و نام آوری حاصل کرو

تین نعرے دوستداروں کے لئے اور دور افتادہ یاروں کے لئے
بے بیان غم گساروں کے لیے بچگان شیر خواروں کے لیے

حکمران بحر و کان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے

جب تلک ہوگا نہ حکم شہریار ہاتھ سے اپنے نہ دیں گے قندھار
ہم جب اول تھے بوقت کار زار چھوڑنے میں سب سے آخر ہوں گے یار

تین نعرے اب خوشی کے ہوں بلند
اب برائے شہریار ارجمند

کیونکہ جب اول میں ان کا نام تھا چاہئے آکر انہیں پر انتہا
روز و شب اب یہ خدا سے ہے دعا ملکۂ وکٹوریا کو ہو بقا

حکمران بحر و کان کی فتح ہے
قیصر ہندوستان کی فتح ہے

شکریہ کرتے ہیں ہم سب کا ادا افسروں کا لشکر و جاں باز کا
بے گماں ہوگا و لیکن بد نما ہم نہ اس کا گر کریں گے تذکرا

جو معالج تھا ہماری فوج کا
چارہ فرما تھا جو ساری فوج کا

ڈاکٹر رایٹ بہادر نام ور بار احساں جس کا ہے سب فوج پر
ہر جگہ وہ فوج کے تھی چارہ گر نام کو ان کے شفا میں ہے اثر

زندگی کا گویا ایک ساماں ہے وہ
زخمیوں کے درد کا درماں ہے وہ

راقم: محمد فصیح اللہ۔ ۵؍صفر، ۱۳۰۰ ہجری

اس کے بعد طوطی ہند داغ دہلوی (۱۸۳۱-۱۹۰۵ء) کی ایک فارسی غزل نقل کی گئی ہے۔ پھر حکیم مومن خاں مومن (۱۸۰۰-۱۸۵۲ء) کی چار غزلیں اور ایک متفرق شعر بیاض مولوی محمد عمر میں شامل ہیں۔

مولوی محمد عمر کے نام ۵/مکاتیب شبلی فارسی کا ذکر اوپر آچکا ہے، مومن کی غزلوں کے بعد دو اور مکاتیب شبلی درج ہیں اور دونوں مکاتیب شبلی دوم حصہ فارسی میں شامل ہیں۔ اس طرح بیاض محمد عمر میں کل ۷/فارسی غزلیں شامل ہیں۔ رزمیہ کابل وقندھار کی طرح ان تمام تخلیقات کے ناقل مولوی محمد فصیح اللہ ہیں۔

اس کے بعد علامہ شبلی کی ابتدائی دور کی چھ فارسی غزلیں اور ایک اردو غزل درج ہے جو کلیات شبلی فارسی میں نقل ہوئی ہیں۔ البتہ علامہ شبلی کے یہ دو فارسی شعر کلیات میں میری نظر سے نہیں گذرے:

برو سحاب گرآبے زچشم خوں بارم
گہر درون صدف خوں شود چو دانہ انار

والہ عارض تو دیدہ وری نیست کہ نیست
بستہ حلقہ زلف تو سر نیست کہ نیست

چوں کہ اردو غزلیں کلیات میں شامل نہیں ہیں، مگر سید صاحب کی نظر سے گذری تھیں۔ مقدمہ کلیات شبلی اردو کے مفصل مقدمہ میں ان کا ذکر موجود ہے۔ اس بیاض میں علامہ شبلی کی ایک اردو غزل کے تین اشعار شامل ہیں۔ ناچیز نے علامہ شبلی کی تمام دستیاب اردو غزلیں اپنی مایہ ناز کتاب آثار شبلی اور نوادرات شبلی میں درج کر دی ہیں۔ اس میں اس بیاض عمر کی یہ اردو غزل بھی شامل ہے۔

اس کے بعد یہ عنوان ہے:

'قصیدہ' در مدح سلطان معظم وخاقان اعظم، سلطان البرین وخاقان البحرین، السلطان ابن السلطان عبدالحمید خان خلداللہ ملکہ۔ از تصنیف لطیف، فاضل یکتا، شاعر عزا، ادیب لاثانی، جناب مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی رئیس اعظم گڑھ۔

مگر یہ قصیدہ یہاں درج نہیں ہے اور بعد کا صفحہ سادہ ہے۔ البتہ اس کے بعد ایک فارسی غزل درج ہے جو کلیات شبلی میں شامل نہیں ہے اور شاید غیر مطبوعہ بھی ہے۔

علامہ شبلی کی ابتدائی دور کی یہ غزل اس لئے یہاں نقل کی جارہی ہے کہ اس سے ان کی صحیح اٹھان کا اندازہ ہوسکے۔وہ غزل درج ذیل ہے:

گرچہ تاراج دل و دیں کردۂ عاشقان را دین و ایمانی ہنوز

تیر تو از سینہ دل خستگان بر نمی آید باسانی ہنوز

دین و دل خو در آشکارا پردۂ ہم چناں از دیدہ پنہانی ہنوز

کشت صدرہ دردہجر موین عجب زندہ ام دارد گراں جانی ہنوز

نیمۂ از وصف تو کم کردہ ام خوب تر از ماہ کنعانی ہنوز

شبلیا چوں زلف اوہم در وصال

جمع گشتی و پریشانی ہنوز

اس کے بعد ایک طویل ساقی نامہ ہے۔کلیات شبلی میں یہ مجھے نہیں ملا،اس لئے قیاس ہے کہ یہ کسی اور شاعر کی تخلیق ہے۔فارسی شعروادب کا میرا مطالعہ بہت محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے اور سوائے شعرالعجم کے میں اس سے قطعی واقف نہیں اس لئے میں اسے تلاش نہیں کرسکا کہ کس کی تخلیق ہے۔

ساقی نامے کے بعد مومن خاں مومن اور انشاء اللہ خاں انشؔا (۱۸۱۷- ۱۸۵۲) کی غزلیں شامل ہیں۔مومن کی غزلوں کے مطلعے یہ ہیں:

تسلی دم واپسیں ہوچکی

ہمیں ہوچکی جب نہیں ہوچکی

کیوں کر یہ کہیں منت اعدا نہ کرسکے

کیا کیا کہیں کہ عشق میں کیا کیا نہ کرسکے

انشؔا کی ایک بڑی مشہور اور میری پسندیدہ غزل کے چند اشعار بھی درج ہیں،لیکن آخر کے تین اشعار ہم وزن اور ہم قافیہ وردیف تو ہیں،مگر انشؔا کی غزل میں وہ شامل نہیں ہیں۔وہ کس کے اشعار ہیں ہم معلوم نہیں کرسکے۔انشؔا کے اشعار یہ ہیں:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

بیاض کے آخر میں مولوی محمد عمر (بیناپارہ) نے ایک نوٹ لکھا ہے کہ "۲۸/اگست ۱۹۱۰ء کو معرفت حاجی حسن علی صاحب ساکن رواں (ضلع اعظم گڑھ) مبلغ ۱۳/روپئے............مع ایک خط کے مولوی حمیدالدین صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ (محمد عمر، از مدرسہ سرائے میر)

مولوی محمد عمر کے نام کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی صراحت سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً وہ اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں کسی عہدہ پر فائز تھے۔ اس لئے کہ ۱۹۱۰ء میں علامہ فراہی تو حیدرآباد میں دارالعلوم کے پرنسپل کے عہدہ پر فائز تھے۔

اسی نوٹ پر مولوی محمد عمر کی اس بیاض کے اندراجات کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

اس بیاض مولوی محمد عمر معروف بہ بیاض شبلی سے جو نوادرات دستیاب ہوئے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے کہ علامہ شبلی کی چار غیر مطبوعہ فارسی غزلیں، چند اشعار اور ایک غیر مطبوعہ طویل اردو نظم (رزمیہ کابل وقندھار) شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مولوی محمد احمد اللہ بندولی کی ایک غیر مطبوعہ تقریظ بھی دستیاب ہوئی ہے۔

بلاشبہ یہ نوادر شبلی مطالعات شبلی میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

•••

علامہ اقبال کا نظریۂ شعر

شمس الدین ملک
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر
maliksd4411@gmail.com

شاعری ایک ایسا فن ہے جو تمام فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور اسے فنونِ لطیفہ کی معراج تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس تعلق سے علامہ اقبال کا ایک شعر بہ طور مثال پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں علامہ کے تصورِ فن کا اختصار موجود ہے۔ یہ ایک ایسا شعر ہے، جس کے دو مصرعوں میں تمام فنونِ لطیفہ کا نہ صرف تعارف مخفی ہے بلکہ علامہ کی نظر میں کوئی فن پارہ کیسے وجود میں آتا ہے؟ اور اس کی مقبولیت کی بنیادی علت کیا ہے؟ یہ سب بھی اس شعر سے افشا ہوتا ہے۔ آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ اس شعر کی طرف ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود[1]

فنونِ لطیفہ کی بنیادی طور پر پانچ قسمیں مصوری، فنِ تعمیر، مجسمہ سازی یا سنگ تراشی، موسیقی، اور شاعری ہیں۔ مذکورہ شعر کے مصرعِ اوّل میں ان پانچوں قسموں کا بالترتیب تذکرہ ہے۔ واضح رہے کہ فنون لطیفہ میں رقص اور تھیٹر بھی شامل ہیں، ان کا تعلق Performing Art سے ہے اور یہ موسیقی اور شاعری ہی کی زائیدہ ہیں۔ دوسرے مصرعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عزو شرف اور قبولیت اسی فنِ پارے کا مقدر ہے، جس کی تخلیق میں خونِ جگر صرف ہوا ہو۔ یہاں لفظِ نمود سے تخلیق اور معجزے سے فن پارے کی قبولیت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کی نظر میں فن کاری، عرق ریزی یا جسمانی ورزش سے زیادہ خونِ جگر یا جگر کاوی کی متقاضی ہے۔ یہ بصارت سے زیادہ بصیرت کی رہینِ منت ہے۔ فن محض کسی دانا اور بینا سے نہیں بلکہ دلِ بینا سے نمو پاتا ہے اور دلِ کی بینائی کا

ا۔ نظم مسجد قرطبہ، مشمولہ بالِ جبریل کلیاتِ اقبال، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء ص ۴۲۱

دارومدار جسمانی مشقت اور ریاضت پر نہیں بلکہ جگر کاوی پر منحصر ہے۔

ع جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

اقبال کے نظریات پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اقبال کے نظریۂ فن کی بہت سی نئی جہتوں سے حجاب اٹھانا ہنوز باقی ہے۔ زیر نظر مضمون اقبال کے نظریۂ فن کی صرف ایک جہت شاعری سے متعلق ہے۔ اقبال ایک عظیم فلسفی ہیں، جنھوں نے شاعری سے پیغامبری کا کام لیا ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ اقبال کی شناخت ایک مصلح یا پیغامبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فلسفی اور نظریہ ساز شخصیت کے طور پر بھی مسلم ہے، انھوں نے عالم انسانیت کو اپنے منظّم فلسفے اور سحر انگیز نظریات سے مسحور کر رکھا ہے۔ ان کے تمام نظریات سے شاید ہم سبھی اتفاق رکھتے ہیں لہٰذا ان کے نظریۂ شعر کو صحیح معنوں میں سمجھنا کاروانِ شعروادب کے لیے خضرِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ اس وقت علامہ اقبال کے نظریۂ شعر پر بات کی جارہی ہے نہ کہ اقبال کی شاعری پر۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کی اقبال کہ شاعری سراپا اعجاز ہے لیکن ابھی اقبال کے پیغامِ شعر سے نہیں بلکہ ان کے نظریۂ شعر سے محبت کرنا ہے۔ اقبال کو شاعر ہونے کا کبھی کوئی دعویٰ رہا نہ زعم۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انھوں نے ایک زمانے میں شاعری کو ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن پروفیسر آرنلڈ اور عبدالقادر سروری جیسے جوہر شناسوں نے اقبال کو اس ارادے سے باز رکھا۔ اگرچہ اقبال کی طبیعت میں فطرتاً شاعری کا ملکہ ودیعت تھا پھر بھی وہ خود کو شاعر تسلیم کرنے سے جابجا انکار کرتے رہے۔ مثلاً:

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے؟[۲]

لیکن اس طرزِ احساس میں ایک ان کی کسرِ نفسی اور دوسری فن کی قدردانی جھلکتی ہے۔ اگر علامہ فن کے قدرداں نہ ہوتے تو وہ ایک عظیم شاعر ہونے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فن کار ہونا ایک اہم ذمہ داری ہے۔ چوں کہ وہ فن کے تمام لوازمات کی پاسداری کے لیے اپنے مقصد کو قربان بھی نہیں کر سکتے تھے اور فن کو داغدار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا وہ خود کو بڑا شاعر اور فن کار ماننے سے انکار کرتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا کلام فن کاری کا عظیم نمونہ ہے۔ علامہ کے ہاں تمام فنونِ لطیفہ کی قدردانی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ دنیا کے ہر علم و ہنر اور فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جیسے:

۲۔ بال جبریل، کلیاتِ اقبال، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۷۹

ہے فلسفہ میرے آب وگل میں پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے اس کی رگ رگ سے باخبر ہے [۳]

اقبال کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ تمام فنون کا ذوق رکھتے تھے۔ ایک عارف، قلندر اور صوفی جیسے خطابات پانے کے باوجود انھوں نے کبھی فنون کے بارے میں کوئی کراہت محسوس نہیں کی۔ وہ موسیقی کے رسیا تھے اور تمام فنون کا ذوق رکھتے تھے۔ وہ خود ایک رندانہ شخصیت کے حامل تھے اور رندی کو پارسائی پر ترجیح دیتے تھے۔ ایک زاہد پارسا ان کی اس روش کا یوں نقشہ کھینچتا ہے:

کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی
رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی [۴]

علامہ کو پہلے قدم پر کسی فن یا ہنر سے شکایت نہیں ہے، اگر شکایت ہے تو بے ہنری سے ہے۔ وہ جس قوم کی تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں، اس میں علم و ہنر کو مقدم رکھتے ہیں لیکن دوسرے قدم پر انھیں ہر اس فن اور ہنر سے شکایت ہے جس میں خودی کی تعمیر اور انسانیت کی فلاح مضمر نہ ہو، جس میں جہد و عمل اور حیات ابدی کے درس کی جگہ بے عملی اور موت کا درس ہو۔ ؏ جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟ اور وہ اس فن کے مداح ہیں جس کی بنا جوہرِ عشق سے تابناک، جس میں عمدہ تخلیقی جوہر اور جدت طرازی ہو، جس کی تعمیر میں حیات اور بقا کا پیغام ہو، جس کی تخلیق میں خونِ جگر صرف ہوا ہو۔

ہے مگر اس نقش کو رنگ ثباتِ دوام جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام [۵]

علامہ اقبال مقصدیت کے قائل تھے اس مسلمے سے یہ اخذ کرنا بالکل روا نہیں کہ وہ فن کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ یہ غلط فہمی دراصل حقائق سے صرفِ نظر کر کے صرف اس قیاس آرائی سے پیدا ہوئی ہے جو اقبال کی پیغامبری کے ساتھ پیوستہ ہے۔ شاعری میں مقصدیت کا قائل ہونا ایک بات ہے اور فن

۳۔ ضرب کلیم، ماخذ سابق، ص ۵۳۰
۴۔ بانگ درا، ماخذ سابق، ص ۹۱
۵۔ مسجد قرطبہ، ماخذ سابق، ص ۴۲۰

برائے فن کو نظر انداز کرنا دوسری بات ہے۔ اقبال فن کو حصولِ مقصد کا اہم وسیلہ گردانتے ہیں۔ وسیلہ اسی صورت میں کارگر ہوسکتا ہے جب اس کا کوئی لازمی وجود ہو یا ذاتی شناخت ہو۔ آسان لفظوں میں یہ کہ فن ہوگا تو اسے مقصدیت کا آلہ کار بنایا جائے گا۔ ہم کسی ناقص اور ناپختہ فن پارے سے کسی بڑے مقصد کو حاصل کرنے کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟ اس لیے اقبال کی ذاتی شاعری خود اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ وہ فن کے قدردان ہیں۔ کچھ ضمنی سوالات ایک الگ محل رکھتے ہیں۔ مثلاً: کیا اقبال بڑے شاعر ہیں یا غالب لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ علامہ کا فنِ شعر ان کے پیش رو، ہم عصر اور بعد کے سینکڑوں شعرا سے افضل ہے۔ البتہ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ وہ شاعری سے خود بھی مقصدِ عظیم کا کام لیتے ہیں اور یہی توقع ہر شاعر سے رکھتے ہیں۔ شاعر یا فن کار وہ ہے جس کا دل بینا ہو، جو اشیائے عالم کی حقیقت سے آگاہی رکھتا ہو اور جس کے فن میں حیاتِ ابدی کے اسرار ابھرتے ہوں، جو مایوسی اور ناامیدی نہیں امید، ہمت اور حوصلے کا داعی ہو۔ اقبال نے فنونِ لطیفہ کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے جو ضربِ کلیم میں موجود ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا؟
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا؟
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا؟[۶]

نظریۂ شعر کا آغاز شعر کی تعریف سے ہونا چاہیے۔ ہمارے یہاں افلاطون اور ارسطو سے قطع نظر شعر کی تعریف کا تعین آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل ابن رشیق سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی تعریفِ شعر آج تک اربابِ نقد و نظر کے مباحث میں شامل ہے۔ وہ کہتے ہیں ''شعر ایسا کلام ہے جو موزوں اور مقفیٰ ہو اور بالقصد کہا گیا ہو''[۷]۔ ابن رشیق سے تاحال شعر کو جتنی طرح سے بیان کیا گیا ہے، اس سے دو طرح کی تعریفیں وضع ہوتی ہیں ایک کو ہم منطقی تعریف کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو عروضی۔ بالارادہ کہنے کی بحث کو چھوڑ دیں تو عروضی تعریف ابھی تک اسی درجے پر ہے جہاں ابن رشیق چھوڑ گئے تھے البتہ منطقی تعریف اپنے climax کے ساتھ ہمیں ورڈز ورتھ Wordsworth کے ہاں ملتی ہے جن کا کہنا ہے کہ:

۶۔ نظم فنون لطیفہ، ضرب کلیم، ماخذ سابق، ص ۶۳۰

۷۔ ''کوئی کلام شعر نہیں کہلاتا جب تک اس میں وزن اور قافیہ نہ ہو'': ابن رشیق، بحوالہ عبدالرحمٰن مرأۃ الشعر، کتاب خانہ نورس، لاہور ۱۹۵۰ء، ص ۱۶۔

Poetry is the spontaneous overflow of powerful feelings. یعنی شاعری طاقتور جذبات کے بے محابہ بہہ نکلنے کا نام ہے لیکن اہلِ علم جانتے ہیں کہ شعر کی حتمی تعریف کا تعین ان دونوں تعریفوں کو یکجا کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا ہے [۸]۔ اس لیے کہ عروض کو نظر انداز کرنے سے شاعری اور نثر میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا ہے اور موخر الذکر کو نظر انداز کرنے سے شعر کا معیار و مرتبہ قائم نہیں رہ سکتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ علامہ کے ہاں شاعری محض عروض دانی اور قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ علامہ کے نزدیک شاعری کارِ پیغمبری ہے لہٰذا یہ الہامی ہے، اس میں آورد سے زیادہ آمد کی اہمیت ہے۔ دراصل وہ شاعری کو قافیہ پیمائی اور عروض دانی سے ایک قدم آگے دیکھتے ہیں۔ اقبال کے ہاں شاعری مظاہرِ کائنات اور مظاہرِ فطرت کے بصیرت آموز مطالعے کا حاصل ہے۔ ان کے نزدیک اعلیٰ شاعری وہی ہے جو حالتِ استغراق میں بنے بنائے ڈھانچوں میں ڈھل جائے۔ جب کوئی دلِ بینا فطرت کے ظاہر اور باطنی اسرار و رموز سے آشنا ہو جاتا ہے تو اس کے باطن میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے جو جذبے کو برانگیختہ کر کے اسے تخیل کی پرواز دے کر فن میں منعکس کرتا ہے۔ یہ سوز اور یہ جذبہ، فطرت سے اس قدر ہم آہنگ ہوتا ہے کہ اسے صفحہ قرطاس پر آنے کے لیے کسی قاعدے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کا سب سے بڑا قاعدہ کلیہ ہے اور تمام قواعد اصول فطرت ہی سے نمو پاتے ہیں۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو   کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی [۹]

دراصل جب شاعر کے باطن میں سوز ہوتا ہے اور اس کا دل بینا ہوتا ہے تو یہ فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے، اسے عروضی سبق یاد نہیں کرنے پڑتے بلکہ اس کے جذبات جب الفاظ کا لبادہ پہنتے ہیں تو وہ از خود موزون ہوتے ہیں، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ موزونیت اور قافیہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری محض قافیہ پیمائی کا نام نہیں ہے۔ یہ عروض دانی اور تک بندی سے بہت آگے کی چیز ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عشق عقل سے آگے کی چیز ہے یا طریقت شریعت سے آگے کی چیز ہے لیکن نہ طریقت شریعت کی منکر ہوتی ہے نہ عشق عقل کا منکر۔ عقل چراغِ راہ کا کام دیتی ہے لیکن یہ حتمی منزل نہیں ہوتی۔

علامہ کے فلسفیانہ نظریات سے شاید آج کا ہر ادب پرور شخص آگاہی رکھتا ہے۔ ان کے تمام فلسفہ جات

۸۔ ورڈز ورتھ Preface To Lyrical Ballads میں:

https://faculty.csbsju.edu/dbeach/beautytruth/Wordsworth-PrefaceLB.pdf

۹۔ غزل بال جبریل، ماخذ سابق، ص ۳۵۳

اور نظریات کا مطلوب و مقصود حیاتِ ابدی ہے۔ان کا اولین فلسفہ خودی ہے جو خود شناسی سے شروع ہو کر خدا شناسی کی انتہاؤں کو چھوتا ہے۔خودی سمیت علامہ کے جتنے بھی نظریات ہیں وہ علامہ کے مرکزی فلسفے،فلسفہ عشق کے محور میں سرگرداں ہیں۔عشق وہ کلیدی شے ہے جس کے بغیر انسان نہ اپنے باطن سے آشنا ہو سکتا ہے اور نہ خارج کی حقیقت اس پر منکشف ہوتی ہے۔اس لیے علامہ شاعری میں بھی عشق کو فوقیت دیتے ہیں۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ علامہ کا عشق سلاتا نہیں جگاتا ہے۔اگر چہ اس عشق میں جذب و مستی بھی ہے، ہجر بھی ہے اور فراق بھی، خودی بھی ہے اور بے خودی بھی لیکن یہ ہر کیفیت میں انسان کو متحرک رکھتا ہے۔یہ اپنے اولین مراتب میں ایک سوزِ باطن ہے اور اعلیٰ ترین مراتب میں ایک ہنگامہ خیز دہکتی آگ ہے جس کی تپش پورے عالم کو گرما سکتی ہے۔یہ موت کا نہیں حیات کا داعی ہے، اس پر موت حرام ہے، اسی لیے علامہ کو اس شاعری سے شکایت ہے جو موت کا داعی ہو جو انسان کو بیدار کرنے کے بجائے اسے مایوسی کی نیند سلاتا ہو:

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے　　خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے [10]

علامہ داخلیت اور درونِ دل کو شاعرانہ مزاج کی اثاث سمجھتے ہیں۔وارداتِ قلبی، جذب وشوق، سوز و گداز، نشاط آمیزی اور طرب ناکی ان کے نزدیک شعر کی کلیدی خصوصیات ہیں:

اقبال نے کل اہل خیاباں کو سنایا　　یہ شعر نشاط آمیز، پرسوز و طرب ناک
میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج　　کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک [11]

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال درد و سوز اور حرارت کی کیفیات پر زور دیتے ہیں کہ شعر ایسا ہو جو سنگ کو موم کر دے۔

یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل　　شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل [12]

علامہ چاہتے ہیں کہ شاعر شعر کے اعجاز سے غفلت کی تاریکیوں کو چاک کرے۔وہ قلوب جو درد و سوز کے توانا جوہر سے محروم ہیں، انھیں شاعری کے ذریعے پرسوز کیا جائے، وہ نگاہیں جو ابھی تک پاک نہیں ہو سکی ہیں، شاعری انھیں پاکیزگی کا سبق دے سکتی ہے تاکہ وہ حسن کے گنجِ گراں مایہ کا نظارہ

۱۰۔نظم سید کی لوح تربت، بانگ درا، ماخذ سابق، ص ۸۵

۱۱۔قطعہ بال جبریل، ماخذ سابق، ص ۴۱۵

۱۲۔خفتگان خاک سے استفسار، بانگ درا، ماخذ سابق، ص ۷۰

کر سکیں۔اقبال کے نزدیک شعر شمشیر اور بارود سے زیادہ طاقت ور ہے،جس شعر میں سوز و براقی ہو وہ شعر سلطنت سے زیادہ طاقت ور ہے اور اقبال کا محبوب شعر ہے:

وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی ‌ عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے [۱۳]

علامہ واضح طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی فکری و معنوی صحت کی تشکیل اس قوم کے فن کاروں اور قلم کاروں کے ہاتھ ہے۔اس لیے وہ اس کا خدشہ جتاتے ہیں کہ اگر فن کاروں نے اپنی قوم کی روشن ضمیری اور بیداریِ خودی کی طرف دھیان نہیں دیا تو قوم کا انحطاط یقینی ہے۔اقبال کا ماننا ہے کہ قلم کار قوم کی تقدیر لکھنے کا کام کرتے ہیں لہٰذا وہ اس خطرے سے باور کراتے ہیں۔ان کے نزدیک کسی برش، تیشہ یا قلم کی چوک چنگیز خان کے لشکر سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> کسی قوم کی معنوی صحت زیادہ تر اس روح کی نوعیت پر منحصر ہے جو اس کے اندر اس کے شعرا اور صاحبانِ فن پیدا کرتے ہیں.......کسی اہلِ ہنر کا مائل بہ انحطاط ضمیر اور تصور ایک قوم کے لیے چنگیز کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ہوسکتا ہے۔[۱۴]

مسلمان شاعر کی ایک اہم ذمہ داری (اقبال کی نظر میں) امت کو کتاب یعنی قرآن حکیم اور صاحب کتاب یعنی سرکار دو عالم کی عظمت سے روشناس کرانا ہے۔کتاب اللہ اور رسول اللہ کی محبت،عظمت اور تعلق ہی میں امت کی نجات پوشیدہ ہے۔اقبال کا بیشتر کلام کتاب اللہ کی تفسیر اور رسول اللہؐ کے عشق کی تعبیر ہے۔قرآنِ حکیم ایک زندہ معجزہ ہے، یہ اُم الکلام ہے اور تمام کلاموں کا سرچشمہ ہے۔قرآن میں غوطہ زن ہوکر جو ہر ابدی حاصل کرنا مقصدِ عظمیٰ ہے۔انسان کے تمام مطالعے کا حاصل یہی ہونا چاہیے کہ وہ خود شناسی سے خداشناسی کا سفر طے کرے۔اسی سفر میں وہ تمام خدمات انجام دے سکتا ہے جو فرد سے معاشرے تک اور اپنی ذات سے خدا کی ذات تک محیط ہے۔اقبال کو ایسے مطالعے سے بھی شکایت ہے،جس سے منزلِ مقصود کا سراغ نہ مل سکے۔منزلِ مقصود کے سراغ کے لیے غفلت سے بیداری پہلی ضرورت ہے۔

اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ ‌ ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ ‌ کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا [۱۵]

۱۳۔بالِ جبریل، ماخذ سابق، ص ۳۹۳

۱۴۔تصدق حسین تاج، مضامین اقبال، احمدیہ پریس چار مینار، حیدرآباد دکن، ۱۳۶۲ھ، ص ۱۶۸

۱۵۔ضرب کلیم غزل کلیاتِ اقبال، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء ص ۵۹۸

امت میں روحِ محمد ﷺ کو جلا بخشنا شاعر کا اہم فریضہ ہے، اقبال کے ہاں عشق نبی دنیا و مافیہا کی ہر چیز سے بالاتر ہے۔ یہی حصول کتاب یعنی حاصلِ قرآن ہے۔ یہ وہ خالص نکتہ ہے جس میں امت کے ہر درد کا مداوا ہے، یہی آبِ حیات ہے، یہی منزل ہے اور یہی راستہ اسی کے سوز سے دل بینا ہوتا ہے اور یہی معرفت کا حاصل ہے، نگاہِ عشق و مستی میں یہی اول ہے اور یہی آخر۔ لہٰذا شاعر کا موضوع و محرک جو بھی ہو اس کی نظر ہمیشہ اسی قبلہ و کعبہ کی طرف مرکوز رہنی چاہیے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے دہر میں اسم محمدؐ سے اُجالا کر دے
ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے[۱۶]

علامہ کے مجموعہ ہائے کلام کے صرف عنوانات ہی پر اگر غور کیا جائے تو ان کے علامتی عنوانات سے جہاں معنی کی کئی جہتیں نظر آتی ہیں، ان میں سب سے خوبصورت جہت یہ ہے کہ پہلے مجموعے کا نام بانگ درا رکھا۔ وہ بانگ درا سے امت کے قافلے کو یکجا کر کے کسی سفر پر گامزن کرتے ہیں، پھر ان میں خودی کے اسرار منکشف کرتے ہیں اور بے خودی کے رموز سے آشنا کراتے ہیں۔ بالِ جبریل کے ذریعے ان کے اندر پیغام ربانی کی روح پھونکتے ہیں، اس راہ میں کئی محاذ آتے ہیں ضرورت پڑنے پر ضربِ کلیمی سے تمام کثافتوں کو پاک کرتے ہیں اور پھر ایک تحفے کی صورت میں امت کو دربارِ رسالت مآب ﷺ کے حضور پیش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آخری مجموعے کا نام ارمغان حجاز ہے۔ اس لیے ایک مسلمان شاعر کی پہلی اور آخری ذمہ داری اقبال کے ہاں یہی ہے کہ وہ فلاحِ امت کا فریضہ انجام دے اور امت کا تعلق اپنے محسن و غم خوار نبی رحمت ؐ کے ساتھ استوار کرے۔ اقبال کہتے ہیں:

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل[۱۷]

قوم کی تشکیل و تعمیر میں شاعری کا کیا رول ہے؟ اس پر علامہ اقبال کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں جو ان کی کابل میں کی گئی ایک تقریر سے ماخوذ ہیں:

۱۶۔ جواب شکوہ، بانگ درا، ماخذ سابق، ص ۲۳۶

۱۷۔ ضرب کلیم، ماخذ سابق، ص ۶۴۴

شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کرسکتا ہے اور برباد بھی۔ اس ملک کے شعرا پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کے بجائے موت کو بڑھا چڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے، اس وقت وہ سخت خوفناک اور بربادکن ہوجاتا ہے اور جو حسنِ قوت سے خالی ہو وہ محض ایک پیغام موت ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است[18]

علامہ اقبال حافظ شیرازی کی شاعرانہ ساحری کو قبول کرنے کے باوجود ان کے کلام کو اس لیے پسند نہیں کرتے ہیں کہ اس میں موجود خیالات اغراضِ زندگی کے منافی ہیں اور یہ قوم کے لیے مضر ہیں یہی وجہ ہے کہ اقبال اس کلام پر اعتبار نہیں کرتے ہیں، اس کے برعکس وہ رومی کو اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ ان کی شاعری سے حیاتِ ابدی کا درس ملتا ہے۔ اس میں عشق کی تپش اور بے باکی ہونے کے ساتھ ساتھ خودشناسی کے اسرار و رموز ہیں۔ جس شاعر کے کلام سے شمشیرِ خودی تیز نہ ہو، جس میں حیات ابدی کے پیغام کے بجائے فنائیت کا سوگ ہو اقبال کی نظر میں ایسے شاعر کا خاموش رہنا بہتر ہے۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دل آویز اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز[19]

(شعرِ عجم، ضرب کلیم)

اقبال شاعری میں اہلِ زبان کی اسناد، استاد شعرا کے برتاؤ اور روزمرہ کی پابندی کے قائل ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ صرف کلام کے نزول اور وجدانی کیفیت پر قناعت کرتے ہیں اگرچہ ان کا یہ ماننا ہے کہ "شعر محاورے اور بندش کی چستی اور درستی کا نام نہیں ہے"۔ لیکن وہ کلام کے محاوروں کو درست کرتے تھے، موزونیت کو پرکھتے تھے، اہل زبان کے مشوروں کو قبول کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر اعتراضات کے جواب استاد شعرا کی اسناد سے دیتے تھے۔ استاد داغ کی اصلاح لی اور اپنے زمانے کے مستند اہل زبان ان کے دوست تھے، جن میں سید سلیمان ندوی اور حبیب الرحمٰن خان شیروانی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ خط و کتابت تو ہوتی ہی رہتی تھی۔ ایک بار ندوی صاحب نے صحت الفاظ اور محاوروں کی درستگی کی طرف اشارہ کیا تو اقبال نے لکھ بھیجا کہ "صحتِ الفاظ اور محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے

۱۸۔ تصدق حسین تاج، مضامین اقبال، احمدیہ پریس چار مینار، حیدرآباد دکن، ۱۳۶۲ھ، ص ۲۰۲

۱۹۔ کلیاتِ اقبال، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۶۳۹

طرف اشارہ کیا تو اقبال نے لکھ بھیجا کہ ''صحتِ الفاظ اور محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر کے رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے''[۲۰]۔ ندوی صاحب کو ایک ترکیب کور ذوق پر اعتراض تھا تو اقبال نے یہی ترکیب ظہوری کے ہاں سے نکال کر دی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فن کی صحت کے متعلق اقبال فکرمند رہتے تھے۔ آج کا شاعر اگر سخن فہمی کے اس بنیادی امتحان میں پاس ہوتا ہے تو بلاخوف اسے علامہ کی باتوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے یعنی اگر کلام میں فطری موزونیت ہے اور عروض کے لوازمات پہ پورا اترتا ہے، اگر محاورے اور روزمرہ کی وہی پابندی ہے جو سند کے ساتھ موجود ہے، اگر کلام میں فصاحت و بلاغت کے کلیدی اجزا موجود ہیں تو بلاشبہ اسے اپنے فن کو کسی منصب خاص کا آلۂ کار بنانا چاہیے۔ اسے بھی وجدانی احوال کا منتظر رہنا چاہیے، بصورتِ دیگر اگر اپنی زبان اور روایت کی بنیادوں ہی کا پاس رکھے تو یہی کارِ خیر ہے۔

مختصر یہ کہ علامہ کے تصور میں فن کاری کے لیے پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ اس کی تخلیق میں خونِ جگر صرف ہوا ہو۔ اس کی تکمیل عقل کے زور سے نہیں عشق کے سوز سے ہوئی ہو۔ بصورتِ دیگر ہر نقش ناتمام اور ہر نغمہ سودائے خام ہوگا۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر[۲۱]

۲۰۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ حصہ اول، ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور، ۱۹۵۱ء ص ۷۱، ۷۲۔

۲۱۔ مسجد قرطبہ کلیاتِ اقبال، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۲۸

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک نوائے پریشاں

عمیر الصدیق ندوی

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو جاننے اور سمجھنے میں جتنی باتیں دلوں سے نکل کر زبان پر آئی ہیں، قریب سوسال میں ان کی کثرت کا اندازہ ہی لگانا ہو تو شاید اس عمل میں کئی روز گزر جائیں۔

غیر معمولی طبیعت، ہمہ گیر شخصیت اور متوازن ذہن اور بے مثال حافظہ کے عناصر جب ایک ذات میں کامل طور پر جمع ہو جائیں تو پھر خطیب، ادیب، سحر طراز، انشا پرداز، صحافی، شاعر، مورخ، مصنف، فقیہ و محدث، مفسر، مصلح، مرشد، مفکر، انقلابی قائد جیسے الفاظ و تعبیرات اس شخصیت کے تعارف کا ذریعہ ہی نہیں بنتے یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ یہ امتیاز و انفراد صدیوں میں بس کچھ ہی کے حصے میں آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا آزاد نے جس زمانہ کو پایا، اس زمانہ نے ان جیسی ممتاز و منفرد ہستیوں کو پیش کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا۔

مثال کے طور پر سرسید، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر کے نام آسانی سے لیے جاسکتے ہیں لیکن غور اور غیر جانب داری سے دیکھا جائے تو مولانا آزاد اس صف میں شامل ہیں اور بعض حیثیتوں سے ممتاز بھی ہیں۔

مولانا آزاد کا مطالعہ کرنے والوں نے کوشش کی کہ ایسی ہمہ جہت اور باکمال شخصیت کو عمر کی مختلف منزلوں میں الگ الگ حیثیت سے دیکھیں کہ کس دور میں وہ کس سے متاثر ہوئے اور دوسروں کو کس طرح متاثر کیا۔ مطالعہ آزاد کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ ان کو سمجھنے میں کوتاہی کی گئی اور اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی کہ اب ایسے لوگ کم ہیں جو مولانا آزاد کی زبان، زور بیان، استعاروں اور الفاظ کے جلال و جمال سے لطف اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک اور وجہ یہ بتائی گئی کہ سیاسی، جماعتی اور ذاتی

اسباب کی بنا پر کچھ رشک اور کچھ حسد نے مولانا آزاد کی عبقریت کے ذکر سے زبانوں کو روک دیا، معاملہ حسد سے شروع ہوا تو کہیں نفرت تک بھی پہنچ گیا، ایک اور وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ مولانا آزاد یا ان جیسی ہمہ جہت شخصیتوں کو جب مجموعہ کمالات کہا جاتا ہے تو جن کی نگاہیں دور تک نہیں پہنچتیں ان کو کمالات کی کثرت میں تضادات کا رنگ نظر آنے لگتا ہے، ان کے لیے وقت اور ماحول کے سمندر میں موجوں کی بے چینی اور لہروں کے سکون کی تہہ میں جانا دشوار ہوتا ہے کہ ایک طرف تو عالمانہ و مرشدانہ زندگی، دوسری طرف عملی سیاست اور اس کے تمام نشیب و فراز، ایک طرف اسلامی مذہبی زندگی تو دوسری طرف سیکولر جمہوری قومیت، ایک طرف مسلم عوام کے شعور کو بالیدہ کرنے کی فکر تو دوسری طرف مشترکہ قومیت کے شعور کو عام کرنے کی فہم۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ کاملیت اور جامعیت کی علامتیں بھی ہوسکتی ہیں، ایسے میں تضاد اور انحراف سے ان کا دور کا رشتہ نہیں۔

سچ یہ ہے کہ ذہن کی آزادی اور ایسی آزادی جو نسل، زبان، علاقہ، ذات اور مذہب کے تنگ دائروں اور تعصّبات سے پاک ہو اور پاک کرنے والی ہو، وہی آزادی جب کسی شخصیت کا جزو اعظم ہوکر کسی پیکر میں ڈھلتی ہے تو وہی پیکر مولانا آزاد بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اور تب لوگ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ مذہب و سیاست کا ایسا حیرت ناک اتحاد ہندوستان میں کسی کا دل و دماغ پیدا نہ کرسکا تھا۔ یہ مولانا آزاد تھے جن کا دماغ گویا قدرت کے معجزات میں شمار رہا۔ دماغ ہی نہیں دل بھی، الفاظ ہی نہیں افکار بھی، اتنی جامعیت اور ایسی سطوت و جبروت سے ہندوستان میں ظاہر نہیں ہوئے۔ ہمارے بڑوں نے جب جب مولانا آزاد کی دنیا کی سیر کرنے کی کوشش کی تو ان کو طلسم خانہ حیرت ہی کا سامنا کرنا پڑا، اس طلسماتی دنیا کو بے خودی میں وہ آہنگ جلال و فرہنگ جمال سے تعبیر کرگئے، ان کو مولانا آزاد جہاں دکھائی دیے وہاں ایسا لگا کہ دلبری اور قاہری دونوں یکجا ہیں، قریب پہنچے تو بوستان سعدی کی ایک حکایت، حقیقت بن کر سامنے آگئی جہاں شمع پروانے سے کہتی ہے کہ اے عشق کے دعویدار، عشق تیرے بس کا روگ نہیں کہ تجھ میں نہ صبر کی طاقت ہے اور نہ قوت برداشت، تو خام حالت میں شعلے سے دور دور منڈلاتا ہے اور مجھے دیکھ کہ میں خاموش کھڑی ہوئی جل رہی ہوں تاکہ جل کے تمام ہوجاؤں۔

تو بگرزی از پیش یک شعلہ خام　　　من استادہ ام تا بسوزم تمام

کہنے والے نے کہہ دیا کہ مولانا آزاد کا دل ساری عمر اسی مصرعہ کو دہراتا رہا کہ ع

من استادہ ام تا بسوزم تمام

وہ تمام عمر سلگتے رہے صرف اس لیے کہ جل کے تمام ہو جائیں، جب کسی ہستی کو زندگی کا یہ عرفان نصیب ہو تو پھر اس قسم کے جملے حیرت انگیز یا مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتے جن میں کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد کی زندگی کے ہزار رنگ اور ہر رنگ میں صد ہزار نیرنگیاں، پھر یہ بتانا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا رنگ زیادہ شوخ اور کون زیادہ گہرا ہے۔

مولانا کی زندگی میں ایک لفظ بڑی شان سے چمکتا دکھائی دیتا ہے اور وہ ہے حزب اللہ، ہم اسی مناسبت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہزار رنگ کا مجموعہ ایک اور رنگ ہے اور وہ ہے صبغۃ اللہ، جس سے خوبصورت کون اور ہو سکتا ہے۔ بڑے اختصار سے لیکن بڑے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی زندگی کی تمام نیرنگیاں اسی ایک رنگ، اللہ کے رنگ کا تماشا اور مظہر تھیں۔

مسمی کو جاننے کے لیے اسم کی اہمیت تو ہے ہی، دین کا احیاء کرنے والا محی الدین، اسلام کی حقانیت کو ہر دم اور ہر پہلو سے ثابت کرنے والا یعنی ابوالکلام اور گفتار و کردار میں کسی غیر کا پابند نہ ہونے والا یعنی مردِ آزاد۔ ان کے نام سے ان کے کام کو جاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔

مولانا آزاد کے کام بلکہ کارناموں کو گناتے گناتے ایک مستقل شعبہ ابوالکلامیات ہی وجود میں آ گیا ہے، سینکڑوں کتابوں اور ہزاروں مقالوں اور مضامین کا صحیح شمار بھی مشکل ہے، لیکن جو کچھ پڑھنے میں آیا اس میں خواہ کتنا ہی تنوع ہو، بنیادی فکر اور مرکزی خیال صرف قوم و ملت کی فکر و خیال ہے اور قوم کی بہبود کے لیے ایک طلب اور تڑپ ہے، کہیں سے پڑھ لیجیے، بس وہی ایک جلنے اور جلتے رہنے والی کیفیت کا احساس۔

۱۹۱۱ء میں ان کی عمر کیا تھی؟ بس یہی تیرہ چودہ سال! اس وقت جب کوئی نوعمر اور کم سن یہ سوچے کہ اس کے سامنے ملک و ملت کے دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھانے کی بات ہو اور ایسے میں منزل کی مختلف راہیں سامنے ہوں تو سوچیے کہ کیا یہ قدرت کا معجزہ نہیں ہے، تیرہ سال کی عمر میں وہ اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک مذہب عمل قرار دے لیتے ہیں، اس عمر میں ان کی خواہش تھی اور یہ خواہش ان ہی کے الفاظ میں پڑھنے کے لائق ہے کہ ''میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانش مند مسافر کی طرح ہو جس نے

سفر سے پہلے راہ ومنزل کے سارے مرحلوں پر غور کرلیا ہو، اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کے رخ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہو۔ میں نے اپنے لیے جو راہ عمل منتخب کی تھی وہ ایک بنیادی اور ذہنی اعتقاد کا قدرتی نتیجہ تھا۔ یہ دعوت وتبلیغ کی راہ تھی، موجودہ زمانہ کی مصلحت پسند لیڈرشپ کی راہ نہ تھی۔ میرے سامنے اتباع واقتدا کے لیے نوع انسانی کے ان مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں کے نام سے پکارے گئے ہیں اور جن کے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں حکمت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، میں اپنی اس راہ طلبی کا ہاتھ ابراہیم ومحمد علیہما السلام کے رہنما ہاتھوں میں دے دینے کے لیے مضطر تھا، میزینی گلیڈ اسٹون اور پارنیل بننے کا عشق میرے اندر نہ تھا، پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا وجود کسی گوشۂ فقر ونامرادی میں خدمت و محنت کا ایک غیر دلچسپ منظر ہوتا، یا انسانوں کے کسی ہجوم میں ایک پکارنے والے کی بے پروا پکار، لیکن یہ بالکل ناممکن تھا کہ بیسویں صدی کے فراموش کردہ عہد نبوت ومذہب کا ایک دلدادہ، انجمنوں کا عہدہ دار اور مجلسوں کا باقاعدہ پریسیڈنٹ ہو، خدا کے رسولوں کا طریق خدمت ودعوت اور بیسویں صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست وحکومت ایک زندگی میں جمع نہیں ہوسکتے۔

یہ جملے انہوں نے ۱۹۲۰ء میں آگرہ میں خلافت کانفرنس کے ایک خطبہ میں کہے تھے، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۸ء تک زندگی ان کو کہاں کہاں لے گئی لیکن ان جملوں کی سچائی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں، انحراف اگر ظاہر بینوں نے تلاش کیا اور مولانا کے بدل جانے کا اعلان کیا وہ شاید مولانا کے ان الفاظ پر غور نہیں کر سکے یا اس کو توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھے کہ ''انحراف کے لیے جس چیز نے مجھے مجبور کیا اس کی حفاظت بھی میرے لیے تمام اصولوں اور قاعدوں سے زیادہ ضروری تھی یعنی اصول کی نہیں بلکہ جس مقصد کے لیے تمام اصول ہیں ان کی حفاظت۔ اصول مقاصد کے لیے ہیں، مقاصد اصول کے لیے نہیں پس دنیا کے اس سچے اور قدرتی قانون کی بنا پر کہ ہر بڑی چیز کے لیے چھوٹی چیز کو اور مقاصد کے لیے وسائل کو قربان کردینا چاہیے......''۔

دیکھا جائے کہ تو جلسہ کی صدارت کو قبول نہ کرنے کے اپنے اصول سے انحراف کی یہ بات تھی لیکن یہ صرف ایک جلسہ کا معاملہ نہیں تھا۔

معاملہ اسلامی وملکی مسائل کی نسبت کام کرنے والوں کے طریق عمل کا تھا، مولانا نے فرمایا کہ ان

لوگوں کے متعلق جو رائے پہلے قائم تھی، بدقسمتی سے اب تک ان میں تبدیلی کا وقت نہیں آیا یہ کہتے کہتے مولانا آزاد وہ ہوگئے جو صرف وہی ہو سکتے تھے، فرمایا کہ:

متضاد مناظر کا کچھ عجیب عالم ہے جسے اپنے چاروں طرف پاتا ہوں، ایک طرف ملک کی عام پبلک ہے اور سورج کی روشنی سے بھی زیادہ یقینی صورت میں دیکھ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر حالات میں وہ کسی صحیح راہ عمل پر چل کھڑے ہونے کے لیے منتظر و مستعد ہے، دوسری طرف کام کرنے والوں کی جماعت ہے اور جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں اس پر اب تک تذبذب واضطراب اور تزلزل وانتشار کا عالم طاری نظر آتا ہے جو پچھلے تمام دوروں میں طاری رہ چکا ہے۔ اب تک مقاصد سے اعراض ہے اور وسائل میں انہماک، اب تک حقیقی مصلحت بینی اور حیلہ جوئی و بہانہ سازی میں امتیاز کی راہ مسدود ہے اور عزم و یقین کی جگہ ظن وشک اور خوف و ہراس کی حکومت قائم ہے، زبانوں کی لکنت گو دور ہو چکی اور شاید چہروں کا ہراس بھی جاتا رہا، لیکن دلوں کی دہشت باقی ہے اور ایمان کی کمزوری نے اب تک ساتھ نہیں چھوڑا ہے، زبانیں جس قدر تیز ہیں، قدم میں اتنی تیزی نہیں اور اعلان جس قدر بلند آہنگی اور رعد آسائی رکھتا ہے، عمل میں اسی قدر وہ نظر نہیں آتی ...... اگرچہ خدا کے مقدس نام کی تقدیس سے اب کوئی زبان ناآشنا نہیں رہی لیکن دلوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا ڈر اور نفس کا عشق بھی باقی ہے۔

مولانا کے یہ خیالات ۱۹۲۰ء میں تھے، لیکن آج بھی ان کی معنویت اسی طرح زندہ ہے۔ آزاد کو پہلے جیسا بھی سمجھا گیا ہو لیکن آج مولانا آزاد، قوم کی سب سے بڑی ضرورت ہیں، ان کی راہ عمل اب بھی اشارہ کر رہی ہے کہ منزل مقصود اسی راہ پر ممکن ہے، انہوں نے تب کہا تھا جب گورنمنٹ کا رنگ سفید تھا اب یہ رنگ بدل چکا ہے لیکن ڈھنگ وہی ہے، انہوں نے اس وقت یہ سوال قائم کیا تھا اور یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے لیے اصل سوال اب یہ نہیں رہا کہ گورنمنٹ کو کیا کرنا ہے؟ صرف یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟

جواب بھی ملاحظہ ہو، مولانا نے فرمایا کہ:

اس بارے میں راہ عمل مسلمانوں کے لیے ہمیشہ سے ایک رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح ایک ہی ہے، میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اسی طرف بلایا ہے اور جب کبھی میری زبان بلانے کے لیے کھلے گی تو صرف

اسی کے لیے کھلے گی یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں، جن میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں..... جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے وہ بالکل اس گلہ کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو، بسا اوقات یکجا ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنا چاہتے ہیں، کمیٹیاں بناتے ہیں، کانفرنس منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی نمائش شریعت کی نظر میں بھیڑ اور انبوہ کا حکم رکھتی ہے، شریعت کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے، افراد و اشخاص کوئی شئے نہیں جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و طاعت میں سرگرم ہوں لیکن یہ سرگرمیاں کچھ سودمند نہیں ہوسکتیں۔

شخصی اعمال کی اصلاح و درستی بھی نظام اجتماع کے قیام پر موقوف ہے، اصلی کام صرف یہی ہے ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے، اس ایک کام پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے، صرف نظر بندوں کے استقبال میں گرد و خاک نہ اڑاتے رہو، غفلت کے بندو، اپنے ایمان کے سراغ میں نکلو کہ اس نے کیوں تم کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے، کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے، اسی قینچی سے پہاڑ کو کترنا چاہتے ہو، ہر زبان تجویزیں پیش کر رہی ہے، ہر قلم امام و مجتہد کی طرح احکام نافذ کر رہا ہے..... کیا اس طوائف الملوکی اور ذہنی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا پورا غدر ہے، کوئی مہم سر کی جاسکتی ہے؟

یہ سوال آج بھی قائم ہے جواب کے لیے مولانا آزاد کے الفاظ بھی ہیں، معاملہ بس سمجھنے اور سمجھانے کا ہے۔

ملی مسائل

ہندوستان میں مسلم تعلیم: جائزہ اور امکانات

ڈاکٹر محمد ارشد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

marshad@jmi.ac.in

تعلیم کے میدان میں ہندوستانی مسلمان بہت پس ماندہ ہیں۔ برادران وطن کے مقابلے مسلمانوں میں شرح خواندگی بھی کافی کم ہے خاص طور پر مسلم خواتین کی تعلیم کا مسئلہ پریشان کن ہے۔ مسلم خواتین میں خواندگی کی شرح پچاس فی صد سے کچھ ہی زیادہ ہے[1]۔ اعلیٰ تعلیم میں بھی مسلمانوں کی نمایندگی تین فی صد سے کچھ زیادہ ہے اور پیشہ ورانہ (پروفیشنل) اور تکنیکی تعلیم میں تو اس سے بھی زیادہ کم ہے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک مسلمان طلبہ کے اندراج کی شرح درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے بھی کم یعنی سب سے کم ہے[2]۔ مذہبی تعلیم جس کا شور وغلغلہ بہت زیادہ ہوتا ہے اس میں بھی ایک رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کے چار فی صد بچے ہی حصول تعلیم کے لیے داخلہ لیتے ہیں[3]۔

ہندوستان میں مسلم تعلیم کی یہ صورت حال کسی بھی طور قابل اطمینان نہیں قرار دی جاسکتی۔ تعلیم کو مخصوص طبقات کی اجارہ داری سے نکال کر اسے آفاقیت عطا کرنے والی امت خود تعلیم کے میدان میں کیوں کر اور کیسے پیچھے رہ گئی؟ یہ موقع اس بحث میں پڑنے کا نہیں ہے۔ اس وقت زیادہ ضروری یہ کام

1- Kamaruzzaman Mollah & Saradindu Bera, "Status of Muslim in India: Problems and Concerns," AMIER Journal, December and January 2018, P:217. https:// www.researchgate.net/publication/ 349173550
(مسلم خواتین تقریباً ۵۲% اور مسلم مرد ۶۲% کل ۵۷%)

2- AISHE 2015-16, Ministry of Human Resource Development, Department of Higher Education, New Delhi, 2016, pp. 40-43./Source DISE 2015-16.

3- Social, Economic and Educational Status of the Muslim Community of India: A Report, Prime Minister's High Level Committee, Cabinet Secretriate, Government of India, New Delhi, 2006, P:77

ہے کہ اجتماعی غور و فکر کے بعد ایک ایسا طریقہ اور لائحہ عمل تیار کیا جائے یا کم از کم اس کی نشان دہی کی جائے کہ اس میدان میں کام کرنے والوں کو اس سے رہنمائی ملے اور مسلم تعلیم کا لٹا ہوا قافلہ ایک بار پھر حدی خواں ہو جائے۔

حالیہ دنوں میں ملک کے اندر مسلم تعلیم کے حوالے سے جس طرح کے واقعات سامنے آئے ہیں اور ملک کی زعفرانی سیاست مسلمانوں کی صورت میں شودروں کی ایک نئی نسل تیار کرنے کے جس منصوبے پر عمل پیرا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ جو بھی افرادی قوت اور وسائل میسر ہیں ان کا استعمال اس طور پر کیا جائے کہ بیش از بیش فوائد حاصل ہوں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس طرح کی صورت حال کا پہلی بار سامنا کر رہے ہوں۔ اس سے قبل بھی جب ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچا اور مسلمانوں کے لیے اپنی شناخت بچا پانا بھی مشکل ہو گیا تو اس وقت کے خیر خواہان ملت نے ایسے اقدامات کیے جو شناخت کی حفاظت اور وقار کے حصول کے لیے ضروری تھے۔ مدارس اسلامیہ کی شیرازہ بندی ہو، سر سید احمد خان کی قیادت میں مسلمانوں کے درمیان جدید تعلیم کے فروغ کے لیے علی گڑھ تحریک کا آغاز ہو یا اسلامی شناخت اور جذبہ آزادی سے معمور دیوبند کی تعلیمی تحریک ہو، سب کی پشت پر یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ان کے خیر امت ہونے کا جیتا جاگتا ثبوت ہو، بدقسمتی یہ رہی کہ مسلموں کی پوری تعلیمی تحریک جس نظام کے خلاف تھی یعنی تعلیم کی دوئی (جسے اس ملک میں انگریزوں نے رائج کیا) خود اسی کا شکار ہو گئی اور مسلمانوں میں دو متوازی تعلیمی نظام رائج ہو گئے۔ ایک دینی تعلیمی نظام کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا عصری نظام تعلیم کے نام سے جانا اور پہچانا گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستانی مسلمان تعلیمی طور پر پس ماندہ ہی نہیں بلکہ ملک کے دیگر پس ماندہ طبقات کے مقابلے میں سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں۔ ان کی تعلیمی پس ماندگی نے انھیں معاشی، سیاسی اور سماجی سبھی میدانوں میں بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ مسلم پس ماندگی، خاص طور پر تعلیمی پس ماندگی، آزادی کے بعد کا یا چند دنوں کا مظہر ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کو پس ماندگی کی اس سطح تک پہنچانے کے لیے اگر ایک طرف ان کی کوتاہ ہمتی، کم کوشی اور مسائل کا جرات مندی کے ساتھ مقابلہ کرنے سے فرار کا رویہ رہا ہے تو دوسری طرف بیرونی عوامل کا کردار بھی اس حوالے سے کچھ

کم نہیں رہا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی دور غلامی میں برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو تعلیم اور روز گار کے مواقع سے جان بوجھ کر دور رکھا جس کا نتیجہ مسلمانوں کی معاشی اور سماجی بدحالی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آزادی کے بعد توقع کی جاسکتی تھی کہ حکومتی رویے میں تبدیلی آئے گی اور آئین ہند میں مساوات اور یکساں مواقع کی جو یقین دہانی کرائی گئی ہے اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے مسلمانوں کو بھی سماج کے دیگر محروم طبقات کی طرح برابری کی سطح تک لانے کے ضروری اقدامات کیے جائیں گے، لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوا۔ آزادی کے بعد بھی سرکاری محکموں میں مسلم مخالف رویہ برقرار رہا اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک کی روایت اب بھی جاری ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی مسلمان جو پہلے ہی کافی پیچھے رہ گیا تھا آزادی کے بعد مزید پس ماندگی کا شکار ہوتا چلا گیا۔

پہلے سے ہی بدحال مسلم معاشرے میں آزادی کے بعد جس طرح کا فکری بدلاؤ آنا چاہیے تھا اور اس سلسلے میں جو کام ہندوستانی مسلم قیادت کو کرنا چاہیے تھا، بوجوہ اس جانب بھی پیش رفت نہ ہوسکی۔ معاشی طور پر کمزور اور ناخواندہ والدین پر تعلیم کی اہمیت واضح نہ ہوسکی، وہ تعلیم کی ضرورت اور تعمیر وترقی میں اس کی معاونت سے بے خبر رہے۔ انھوں نے پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے بجائے دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے انھیں چھوٹے موٹے کاموں میں لگا دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم معاشرے میں ناخواندوں اور معاشی طور پر کمزوروں کی فوج درفوج تیار ہوتی چلی گئی۔

ایک بڑا مسئلہ لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے مسلم معاشرے کا عمومی رویہ رہا ہے۔ وجہ جو بھی رہی ہو، عام مسلمانوں میں یہ بات پھیل گئی کہ لڑکیوں کی تعلیم کی اجازت مذہب نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم معاشرے کی آدھی آبادی کو حصول تعلیم اور اس کے سہارے آگے بڑھنے کے مواقع سے محروم کردیا گیا۔ جب گھر کا ماحول، جس کو بنانے میں ماں کا کردار کلیدی ہوتا ہے، تعلیم کی اہمیت سے بے گانہ رہا تو پھر اس میں پرورش پانے والی نسل کیوں کر اور کیسے تعلیم یافتہ ہوسکتی ہے؟

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آزادی کے بعد بھی مسلم آبادی والے علاقوں تک تعلیم کی سہولیات نہیں پہنچیں۔ مسلمانوں کی آبادی والے علاقے عام طور پر سرکاری اسکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں سے محروم ہیں اور اگر کچھ اسکول وغیرہ موجود بھی ہوتے ہیں تو ان میں انفرااسٹرکچر وغیرہ کی ایسی کمی ہوتی ہے کہ معمولی پرائیویٹ اسکول بھی ان سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عموماً شہری آبادی کے

حاشیوں پر پڑے مسلم محلے معاشی بدحالی کے ساتھ بنیادی شہری سہولیات سے بھی محروم ہیں۔ایسے میں ان کے لیے دور دراز کے مہنگے پرائیویٹ اسکولوں میں تو کیا سرکاری اسکولوں تک بھی اپنے بچوں کو بھیج پانا مشکل ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے علاقوں میں جو چند ایک سرکاری یا پرائیوٹ اسکول ہوتے ہیں ان میں بھی بنیادی تعلیمی سہولتیں عموماً مفقود ہوتی ہیں۔مسلم آبادیوں کے نام نہاد اچھے پرائیویٹ اسکول بھی عام طور پر دیگر طبقات کے تیسرے درجے کے اسکولوں کی برابری بھی نہیں کرتے۔اس کی اہم وجہ یہی ہے کہ عام مسلمان یا تو تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو نہیں سمجھتے یا پھر ان کے حالات کسی بھی طور اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کی اجازت نہیں دیتے۔

جدید تعلیم سے مسلمانوں کی دوری اور محرومی کا ایک سبب اس مفروضے، بلکہ بڑی حد تک حقیقت کا ان کے ذہنوں میں جاگزیں ہو جانا ہے کہ نوکریوں میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور جب نوکریاں ملی ہی نہیں تو پھر تعلیم پر وقت اور وسائل کیوں برباد کیے جائیں۔

برطانوی ہندوستان میں تعلیم کے حوالے سے ہندوستانی مسلمانوں کے دو روپے سامنے آئے۔ایک انگریزوں کے ساتھ مفاہمت اور جدید تعلیم کے ترجیحی حصول کا اور دوسرا انگریز مخالفت اور مسلم شناخت کے لیے روایتی تعلیم پر اسرار کا۔یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان عموماً جدید تعلیم سے دور رہے اور اس کے برعکس روایتی تعلیم کی طرف ان کا میلان زیادہ رہا لیکن اس میں آدھی سچائی ہے۔مسلمان روایتی تعلیم کی طرف بھی نہیں گیا۔سچّر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کے صرف چار فی صد بچے مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

ایک کڑوی سچائی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے روایتی تعلیم کے لیے جو مدارس برطانوی عہد کی ضرورتوں کے مطابق تعمیر کیے تھے آزادی کے بعد جب حالات بدل گئے تو لازمی طور پر مدارس کے حالات بھی بدلنے چاہئیں تھے اور ان میں نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق نصاب اور نظام تعلیم دونوں سطح پر اصلاح کا عمل جاری ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ مدارس نے اپنی سابقہ حالت پر اصرار کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی معنویت دن بہ دن گھٹتی چلی گئی۔

ایک المیہ یہ بھی رہا کہ مکاتب و مدارس کی سطح پر ہی سہی تھوڑا بہت لڑکوں کی تعلیم کا انتظام تو ہوتا رہا

اورانہیں کسی قدر خواندہ یا تعلیم یافتہ بنانے کی مہمات بھی چلتی رہیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے نہ تو کوئی بڑی مہم چلائی گئی نہ ہی کوئی انتظام ہوا بلکہ عموماً ان کو اس طرح کی تعلیمی سہولیات سے بھی محروم رکھا گیا جو مسلمان لڑکوں کو حاصل تھیں۔ چند گنے چنے ادارے ہیں جہاں لڑکیوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام ہے اور ان میں بھی اکثریت پچھلی تین چار دہائیوں کی مرہون منت ہے۔

اس صورت حال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے آئین میں فراہم کردہ تحفظات کی روشنی میں ایسے اقدامات سامنے آئیں جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے ضامن ہوں بلکہ ان کی سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی کو بھی یقینی بنا سکیں۔ اس کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو آئینی تحفظات کی حدود میں رہتے ہوئے ایک ایسا تعلیمی لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے جو قابل عمل بھی ہو اور مفید مطلب بھی۔ اس حوالے سے ایک اہم تجویز آزادی سے کچھ پہلے مولانا مناظر احسن گیلانی نے ''میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ''[۴] کے عنوان سے ماہانہ معارف اعظم گڑھ میں شائع کی تھی۔ یہ تجویز اتنی اہم ہے کہ اگر آج بھی اس پر عمل شروع ہو جائے تو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل بڑی حد تک حل ہو سکتے ہیں۔ مولانا گیلانی کی تجویز کے مطابق مسلمانوں کے موجود نظام و نصاب تعلیم سے مضامین کی دوئی (دینی وعصری مضامین) کو ختم کر دیا جانا چاہیے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں میں انگریزوں سے پہلے دینی وعصری تعلیم کا تصور ہی نہیں تھا۔ مسلمانوں کے درمیان دینی وعصری تعلیم کی تقسیم کا رجحان انگریزوں کا پروردہ ہے۔ مسلمانوں کا نظام و نصاب تعلیم ہمیشہ وحدت پر مبنی رہا۔ اس لیے مولانا گیلانی نے اپنی تجویز میں سفارش کی ہے کہ مسلمانوں کو وحدت تعلیم کے تصور کی طرف لوٹنا چاہیے۔ ان کی تجویز کے مطابق بنیادی دینی تعلیم (جس میں قرآن، حدیث اور فقہ کے مضامین کی جامع کتب شامل ہوں) کو نصاب تعلیم کی اساس قرار دے کر طالب علم کے لیے تعلیم کے میدان کو کھلا چھوڑ دیا جائے جہاں وہ اپنے مزاج اور رجحان کے مطابق موجودہ زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے والے مضامین کی تعلیم حاصل کر سکے۔ ان کے خیال میں اس طرح ایک ہی نظام تعلیم سے ایسے ماہرین علم و فن تیار ہو سکیں گے جو دین کا علم رکھنے

۴۔ گیلانی، مولانا سید مناظر احسن، میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ، معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۴۵ء، ص: ۵-۵۱۔ (یہ مضمون بعد میں ان کی مقبول عام کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کی دوسری جلد کے شروع میں شائع کر دیا گیا ہے۔)

کے ساتھ اپنے اپنے شعبوں کے ماہرین بھی ہوں گے۔ اس کے لئے مولانا گیلانی نے ملا ڈاکٹر ملا انجینئر، ملا فلسفی، ملا ادیب، ملا شاعر وغیرہ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔

آئین ہند میں فراہم کردہ تحفظات: آزادی کے بعد کا ہندوستان بدل چکا تھا۔ صدیوں سے یہ ملک متعدد اور مختلف مذہبی، ثقافتی، لسانی اور سماجی گروہوں کا مسکن رہا ہے۔ اس لیے آزاد ہندوستان کے بنیاد گزاروں نے جب اس ملک کا آئین بنایا تو اس میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ ہر ہندوستانی کو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہبی، ثقافتی، لسانی اور سماجی گروہ سے ہو، آئینی تحفظات فراہم کیے جائیں، اسے اس ملک میں امن وامان کے ساتھ رہنے اور حقوق ومواقع سے یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔ اس تعلق سے آئین ہند کی جن دفعات کے تحت ملک کے تمام شہریوں کو مساوی حقوق ومواقع فراہم کیے گئے ہیں ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

آئین ہند کی دفعہ ۱۴ کے مطابق قانون کے روبرو تمام شہری برابر ہیں اور قانون سب کا یکساں تحفظ کرے گا۔

آئین کی دفعہ ۱۵ کے مطابق مذہب، نسل، ذات پات، صنف اور جائے پیدائش کی بنیاد پر تفریق ممنوع ہے۔

آئین کی دفعہ ۲۱ کے مطابق کسی شخص کو اس کی زندگی یا شخصی آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا سوائے قانون کے ذریعے متعینہ طریقۂ کار کے۔

آئین کی دفعہ ۲۵ کے مطابق ہر شہری کو ضمیر کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ اسے آزادانہ طور پر کسی بھی مذہب پر عمل کرنے، اس پر اعتقاد رکھنے اور اس کی نشر واشاعت کا حق حاصل ہے۔

آئین کی دفعہ ۲۶ کے مطابق شہریوں کو مذہبی اداروں کو قائم کرنے، انھیں چلانے اور مذہبی معاملات کو انجام دینے کا حق حاصل ہے۔

آئین کی دفعہ ۲۹ کے تحت اقلیتوں کو یہ ضمانت فراہم کی گئی ہے کہ وہ اپنی زبان رسم الخط اور ثقافت کا تحفظ کر سکیں۔

آئین کی دفعہ ۳۰ میں اقلیتوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مصالح کے تحفظ کے لیے آزادانہ تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان کو چلائیں۔ اس دفعہ میں ریاست کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ امداد منظور کرنے میں

اقلیتوں کے خلاف کسی طرح کی کوئی تفریق نہ کرے۔

آئین کی دفعہ ۳۵۰ (اے) میں ریاست کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کے لیے سہولت فراہم کرے[۵]۔

ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ یہ رہا ہے کہ آزادی کے بعد ان کی قیادت نے آئین کے تحت حاصل ان زریں تحفظات سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا اور امکانات کے کئی دروازے اپنے آپ پر بند کر لیے۔ اس کے لیے ذمہ دار جہاں ایک طرف ریاست کا مسلم اقلیت کے تئیں امتیازی رویہ رہا وہیں مسلم قیادت کو بھی اس حوالے سے کلین چٹ نہیں دی جا سکتی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ، تشخص اور تعمیر و ترقی کی کوئی بھی مہم یا تحریک تعلیم کے میدان سے گزرے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہندوستانی مسلم قیادت اور عام ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ پس ماندگی اور پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے اپنے حالات اور وسائل کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی تعلیمی مہم کا آغاز کریں جو مسلمانوں کو تعلیم سے جوڑنے والی ہی نہ ہو بلکہ جو تعلیم تک سبھی کی رسائی کو آسان اور یقینی بنانے والی بھی ہو۔ اس کے تحت ایک ایسا لائحہ عمل تیار ہو جس میں آئین میں حاصل تحفظات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موجود وسائل کے بہتر استعمال کی راہیں نکالی جا سکیں اور انھیں زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جا سکے۔

۵۔ راجپوت، جے ایس، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم (اردو ترجمہ)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۲۱ء، ص: ۶۵-۶۶ (آئین ہند کی دفعات کا خلاصہ اس کتاب سے لیا گیا ہے)

اخبار علمیہ

زمین کے قریب آنے والا ایک بڑا سیارچہ

امریکی خلائی ایجنسی (ناسا) نے اعلان کیا کہ ۱.۲ کلومیٹر قطر کا سیارچہ ۱۳۹۶۲۲ (۱۴۲ q q) زمین کے قریب ۵.۵ ملین میٹر کی دوری سے گذرا۔ یہ زمین کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔ اجرام فلکی سے زمین کا مدار ۰۵.۰ یونٹس تک کے فاصلے پر تصور کیا جاتا ہے۔ کسی بھی سیارچہ کا ۵.۷ ملین کلومیٹر سے کم کا فاصلہ خطرناک ہوسکتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ماہرین فلکیات نے یہ سیارچہ ۲۲ اگست ۲۰۰۱ء کو دریافت کیا تھا اور ۲۲ سال بعد اپنا دورہ مکمل کرکے اب یہ اپنے اس مدار میں پہنچا ہے جہاں سائنس دانوں نے اس کو دیکھا تھا۔ (صحیفۃ الوطن بحرین ۷ دسمبر ۲۰۲۳ء ص ۱۶)

۸۶ سال قبل لاپتہ سنہرا چھچھوندر، جنوبی افریقہ میں دیکھا گیا

ڈیلی میل کے مطابق محققوں کی ایک ٹیم نے جنوبی افریقہ کے ایک ساحل پر ایک چمک دار سنہرا چھچھوندر دریافت کیا ہے۔ جب کہ ۱۹۳۶ء میں اس نوع کے تمام نشانات غائب ہونے کے نتیجہ میں اسے معدوم سمجھا جاتا تھا۔ De Winton نام سے معروف نایاب جانور، جو سننے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتا ہے، جنوبی افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع پورٹ نولوتھ میں خطرے سے دوچار ہے۔ جنگلی حیات فاؤنڈیشن EWT اور یونیورسٹی آف پریٹوریا کی ٹیم نے اس کو دریافت کیا ہے۔ ہامسٹر (ہامستر) کے سائز کے یہ چھوٹے جانور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انسانوں سے بچتے ہوئے زمین کے اندر گزارتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا پتہ لگانا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس مخصوص نسل کو افریقہ میں ہیرے اور معدنیات نکالنے کی سرگرمیوں کی وجہ سے خطرہ لاحق تھا اور جب یہ ۸۶ سال قبل لاپتہ ہوگئی تھی تو محققین نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جانوروں کی یہ قسم اب ناپید ہوگئی ہے لیکن ڈی این اے ٹکنک کا استعمال کرتے ہوئے محققین پولس کتے کی مدد سے اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئے، جس کی وجہ سے وہ ساحل سمندر پر چھپی ہوئی سرنگ تک پہنچ گئے تھے۔ محققین پولیس نے اپنی تحقیق ۲۰۲۰ء میں خطرے سے دوچار De Winton (ڈی وینٹن) کی بہن کی نسل Van Zyl (وان زیل) کے نمونوں کا استعمال کرتے ہوئے شروع کی تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ آیا یہ ٹکنک قابل عمل ہے۔ (صحیفۃ الوطن بحرین ۷ دسمبر ۲۰۲۳ء ص ۱۶)

ک، ص اصلاحی

وفیات

صاحبزادہ شوکت علی خاں مرحوم

(۱۹۳۶ء-۲۰۲۳ء)

گذشتہ مہینے اردو کی علمی وادبی دنیا ایک بار پھر دو صاحبان علم وقلم کی وفات سے اداس اور ویران سی ہوگئی، ان میں ایک اردو کی قدیم اعلیٰ علمی تحقیقی قدروں کے گویا نمائندہ تھے اور ان ہستیوں میں تھے جن کو دیکھنے کی تمنا کی جاتی تھی، لیکن اقدار وروایات کے سکڑنے اور مٹنے کا اثر ہے کہ عرصہ سے اردو دنیا کو ان کی خبر نہ تھی اور اب جب وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیائے دوں سے رخصت ہوگئے تو بھی ان کی یاد اور ذکر سے جیسے کسی کو کوئی واسطہ نہیں۔

یہ دونوں قابل قدر وتکریم واعتراف شخصیتیں صاحبزادہ شوکت علی خاں اور ڈاکٹر امام اعظم کی ہیں، ان دونوں میں ایک نسل کا فرق ہے، لیکن ان کا عرصۂ عمل بتاتا ہے کہ علم وادب کی خدمت میں ان میں کوئی فرق نہیں۔

صاحبزادہ شوکت علی خاں ۱۱؍جولائی ۱۹۳۶ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ٹونک تو بجائے خود ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اردو کی عظیم الشان بستیوں کے ذکر میں اس کا نام ذرا دیر میں زبان پر آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ دہلی ولکھنؤ کے بعد حیدرآباد، بھوپال اور رامپور جیسی ریاستوں کی فہرست میں ٹونک کی ریاست کا درجہ کسی طرح کم تر نہیں، راجستھان کو اردو خطہ کی حیثیت سے کم جانا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو نے راجستھان کو اور راجستھان نے اردو کو ایک الگ بانکپن دیا ہے اور اس بانکپن میں سب سے بڑا حصہ ٹونک کا ہے، جہاں منتخب روزگار اکابر علما اور مشاہیر ادباء کا مجمع تھا۔ محمود غزنوی سے حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید تک کے نقوش قدم نے اس خوبصورت شہر کی زمین کو رشک ماہ ونجوم بنا دیا، تو دوسری طرف خود اس کے آسمان میں نواب وزیرالدولہ، حیدر حسن خاں محدث، محمود حسن خاں صاحب معجم المؤلفین، حکیم برکات اور محمود خاں شیرانی اور شاعر رومان اختر شیرانی علم وفن کے ستارے بن کر ایک عالم کو تب وتاب کی نعمت سے آشنا کرتے رہے۔

ریاست ٹونک کی یہ سرمایہ ناز تاریخ یقیناً قصۂ پارینہ بن چکی، لیکن وہاں کی شہرۂ آفاق سنہری بارہ

دری کی طرح قریب ایک صدی تک اس کی تصویر کا رنگ اور روغن کی چمک اگر برقرار رہی تو اس کی وجہ صاحبزادہ شوکت علی خاں کی شخصیت تھی، جن کے دم سے مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جیسا مایہ ناز ادارہ قائم ہوا اور جن کی وجہ سے ٹونک کی سرزمین ایک بار پھر مرجع علما و محققین بن گئی، جس نے اس ادارہ کی زیارت کی اس کو ٹونک کے نوابوں، ادیبوں، قاریوں، خطاطوں اور دانشوروں کی عظمت پر ایمان لانے میں ذرا بھی توقف نہیں ہوا۔ یہ پورا انسٹی ٹیوٹ بلکہ اصلاً کتب خانہ اور نوادر کا خزانہ صرف اور صرف شوکت صاحب مرحوم کی بلند ہمتی کا آئینہ خانہ بن گیا۔ کمال نہیں تو کیا ہے کہ انہوں نے دس ہزار سے زیادہ مخطوطات جمع کیے، ویسے ان کی شہرت ادیب، مورخ، مصنف اور شاعر کی حیثیت سے بھی کم نہیں، ان اوصاف علمی کے ساتھ وہ خطاط بھی اعلیٰ درجہ کے تھے اور یہ خوبی شاید ٹونک کے اہل علم کے ساتھ ہمیشہ نظر آئی، بتایا گیا کہ وہ ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے، اردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی میں بھی ان کی کئی کتابیں ہیں ان میں ترجمے بھی شامل ہیں۔

ان کی علمی شہرت میں بڑا حصہ ان کے ان مقالات کا ہے جو نصف صدی سے بھی پہلے، معارف میں شائع ہوئے۔ ٹونک کے کتب خانے اور ان کے نوادر، تاریخ غریبی، ٹونک کے تاریخی مخطوطات، جہانگیر کے دور کا ایک نایاب مخطوطہ جیسے نہایت اعلیٰ تحقیقی مضامین سے ان کی علمی قدر و قیمت میں بڑا اضافہ ہوا۔ لیکن ان کے جوہر تو تب کھلے جب انہوں نے نواب وزیرالدولہ کے جانشین نواب محمد علی خاں کے کتب خانہ کے نوادر اور ان سے پہلے نواب سعیدالدولہ معروف بہ سعیدالدولہ کے کتب خانہ سعیدیہ کی کتابوں کے ایک مشترکہ کتب خانہ میں بحیثیت ناظم ذمہ داری سنبھالی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کتب خانہ کے بڑے قدرشناس تھے، انہوں نے راجستھان کی حکومت سے اس کی حفاظت پر خاص طور سے توجہ دلائی، موجودہ مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسی تعلق کا گواہ ہے، اور یہ صاحبزادہ شوکت علی خاں کی محنت، لیاقت اور دوراندیشی کا بھی ثبوت و شاہد ہے۔ وہ اس ادارہ کے بانی بھی تھے اس کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دیکھنے کی عزت و مسرت جن خوش نصیبوں کو حاصل ہوئی وہ مخطوطات کی ندرت، نوادر کی عظمت اور قرآن مجید کے نہایت حیرت انگیز خطاطی کے نسخوں اور پھر ان کی حفاظت، نگہداشت اور ان کے بارے میں معلومات کی نہایت دلکش پیش کش میں جگہ جگہ جس سلیقہ اور نفاست کو سامنے پاتے ہیں اس میں صاف صاحبزادہ شوکت علی خاں کی

شبیہ جھلکتی نظر آتی ہے۔

خود ان کی شخصیت ایک پرکشش وجود سے عبارت تھی، قد وقامت کی درازی و بلندی کے ساتھ ان کی گفتگو میں انکسار اور اخلاص کی آمیزش، ان کی قربت کی درازی کے لیے دعا کرنے پر مجبور کر دیتی۔ دارالمصنّفین خصوصاً ان کے عہد کے شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا ذکر چلتا تو وقت تھم جاتا اور دسترخوان سرد سا ہو جاتا۔ ان کی خورد نوازی اصلاً ہماری تہذیب کی ایک مٹتی جاتی قدر کو زندگی بخشنے کی شعوری کوشش تھی۔ ان کا کاشانہ نہایت وسیع و عریض ہوسکتا ہے لیکن ان کی محبت خصوصاً دارالمصنّفین سے ان کی شیفتگی کسی بھی پیمایش سے زیادہ تھی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ دارالمصنّفین کے صدسالہ جشن میں وہ معارف کے نصف صدی سے بھی زیادہ کے مضمون نگار کی حیثیت سے شامل ہوں لیکن بعض عوارض نے یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

قریب ۸۷ سال کی ان کی زندگی، دیکھا جائے تو وہ ٹونک کی کئی صدیوں کی زندگی کا عکس بن گئی، شکر ہے کہ ان کے صاحبزادے صولت علی خاں ان کے نقش پا کی چمک سے واقف ہیں، ٹونک میں اب بھی وہاں کے کئی مشاہیر علما کے خانوادے امانت اور حفاظت کے معانی سے بے خبر نہیں، ان سب پر صاحبزادہ شوکت علی خاں اور ریاست ٹونک کی شوکت وحشمت کو باقی رکھنے کی ذمہ داری ہے۔

آہ! ڈاکٹر امام اعظم

(۱۹۶۰ء-۲۰۲۳ء)

سید اعجاز حسین دربھنگہ میں پیدا ہوئے اور ڈاکٹر امام اعظم کے قلمی نام سے اردو کی نئی نسل کے ہونہار صاحب قلم کی حیثیت سے متعارف ہوئے، اسی لیے جنھوں نے ان کو قریب سے نہیں دیکھا، ان کے ذہنوں میں ابھی تو وہ جوان ہی تھے، ان کی کتابوں اور ان کے رسالہ تمثیل نو سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۶۰ء میں پیدا ہوئے، اس طرح انھوں نے ترسٹھ سال کی عمر پائی۔ لیکن ان کے کاموں اور کارناموں کا تسلسل دیکھ کر یہ عمر کم ہی معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم اس وقت اردو کے معدودے چندان اہل قلم کے قبیلے میں شامل تھے جن کی ایک بڑی پہچان ان کا صاحب تصانیف کثیرہ ہونا ہے۔ ڈاکٹر الیاس اعظمی، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، علیم صبا

نویدی یہ سامنے کے نام ہیں اور کچھ عرصہ پہلے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کثرت تصانیف کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں پر تھے، اور اب بھی یہ دوسروں کے لیے قابل رشک ہیں، ان میں سب سے کم عمر ڈاکٹر امام اعظم ہی تھے، خود اپنے قلم سے ساتھ ہی دوسروں کو اپنے خوان علم وقلم میں شریک کر کے پس پردہ وہی نظر آتے۔ان کی یہی ایک صفت ہی ان کی قدر کے لیے کافی تھی، لیکن یہ بھی ان کی امتیازی صفت نظر آتی ہے کہ وہ قلم کے لیے موضوعات میں تنوع اور جدت پر خاص توجہ دیتے۔ تاریخ تحقیق، شعر سوانح، مذہب تصوف کہیں بھی وہ اجنبی نظر نہیں آتے تھے۔ مظہر امام کا تنقیدی مطالعہ، مولانا عبدالعلیم آسی تعارف، گیسوئے تحریر، اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب، اکیسویں صدی میں اردو صحافت، گیسوئے اسلوب، گیسوئے افکار جیسی کتابوں کے ساتھ سہرے کی ادبی معنویت جیسے ایک بالکل الگ موضوع پر نمائندہ کتاب ان کی فہرست کتب میں شامل ہوگئی، شعری مجموعے ایک کے بعد ایک نکلتے رہے، گیسو کا لفظ بھی ان کی ترجیحات میں شامل ہوا، شاید اس کی وجہ وہ مصرعہ ہو جو یاد دلاتا رہتا ہے کہ گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔

دربھنگہ سے علوم اسلامیہ کے تعلقات کی تاریخ تلاش کرنے اور زندگی دینا بھی ان کے پیش نظر ایک ضروری عمل تھا۔ کسی نہ کسی عنوان سے وہ دربھنگے کی تہذیبی، علمی اور دینی روایات کی داستانیں سناتے یا اپنے زیر اثر لکھنے والوں سے سنوا دیتے۔ اہل علم کے لیے دربھنگہ کی تاریخی وعلمی اہمیت کوئی نئی بات نہیں لیکن امام اعظم نے جس طرح اپنے وطن کی محبت میں عقیدت کو شامل کیا، اس کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ چند مہینوں پہلے انہوں نے ایک کتاب 'انساب وامصار' بھیجی۔ ایک فراموش ہوتے علم کو زندہ کرنے کی یہ کوشش ظاہر ہے خاصی محنت طلب تھی، ان کو فوراً اس کے لیے اور اس سے بڑھ کر کتاب کی نہایت خوبصورت طباعت اور تزئین کے لیے مبارکباد دی گئی، چند مہینوں کے بعد انہو ں نے تبصرہ کے لیے یاد دلایا لیکن تقدیم وتاخیر کے ناگزیر اسباب کی وجہ سے ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی، بہت سے ارمانوں کے پورا نہ ہونے کی طرح اس کا بھی قلق ہمیشہ رہے گا۔ ایک اور تاریخی کتاب جو دراصل کلکتہ شہر کی منظوم تاریخ ہے، اس کی بڑی شہرت ہوئی، غالباً ان کا یہ آخری شائع شدہ تحفہ ہے جو کلکتہ والوں سے ان کے تعلق کو شریفانہ احسان شناسی کے لحاظ سے زندہ رکھے گا۔

ان کی زندگی واقعی نہایت متحرک اور شاید ضرورت سے زیادہ محنت ومشقت کی عادی ہوگئی تھی،

ایک نامور اردو پروفیسر نے لکھا کہ نوجوان اردو اساتذہ اور قلم والوں میں ایسی توانائی، جوش اور صلاحیت بہت کم ملتی ہے، متحرک تھے، مستعد بھی تھے، اس کی سب سے بڑی مثال ان کا رسالہ تمثیل نو ہے، سینکڑوں صفحات پر مشتمل یہ رسالہ پابندی سے نکلتا ہے، مختلف ادبی و مذہبی موضوعات کو ایک الگ حصہ میں خصوصی مطالعہ کے تحت پیش کیا جاتا ہے، ایسا ہی ایک یادگار شمارہ اکیسویں صدی میں اردو صحافت کے نام سے بہت مقبول ہوا، تمثیل میں یوں تو زیادہ مضامین ریسرچ اسکالر کے ہوتے، لیکن بزرگوں کی تحریروں کا بھی اہتمام کیا جاتا، تمثیل نو میں اداریہ 'مجھے کچھ کہنا ہے' شاید ہندو پاک کے تمام رسائل میں اس لحاظ سے سب سے منفرد ہوتا کہ اردو دنیا کی ساری ادبی، ثقافتی اور وفیاتی خبریں مل جاتیں، تعجب ہوتا کہ کاموں کے انبار میں وہ اپنا وجود کس طرح برقرار و متوازن رکھتے ہیں، ان کے کام کی رفتار کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اردو کے قریب ہر ادیب و شاعر سے مکتوباتی یا ٹیلیفونی رابطہ رکھتے، ڈاکٹر شاہد اقبال نے مکتوبات کے ایک مجموعہ میں قریب ساڑھے چار سو ادیبوں اور شاعروں کے خطوط جمع کر دیے، یہ صرف ایک جلد کی بات ہے اور سب سے بڑھ کر حیرت اس پر کہ ان علمی کاموں کے ساتھ وہ درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے۔ برسوں سے وہ مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ کاموں اور ذمہ داریوں کا بوجھ کبھی کبھی دل کی دھڑکنوں کو شکوہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، چنانچہ دل کے مریض ہو گئے۔ ۲۳ نومبر کی شب میں وہ اپنے ایک شاعر دوست کی محفل سے دیر شب گھر آئے اور سوئے تو یہ آخر شب کے ہم سفر کی نیند تھی، چوں کہ گھر میں تنہا تھے، کسی کو خبر نہ ہوئی، ہاں بستر پر کئی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہی ساری داستان سنا رہی تھیں، کلکتہ سے ان کا جسد خاکی دربھنگہ لایا گیا اور ایک علمی خاندان کا نہایت ہونہار چشم و چراغ گھر ہی نہیں پوری اردو دنیا کو ویران کر گیا۔ دوست احباب سب کہتے ہیں کہ گمان تک نہ ہوا وہ بچھڑنے والا ہے۔ دعا ہے کہ دونوں مرحومین کی نیکیوں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، **اللهم اغفر لهما وارحمهما۔**

اس تحریر میں بعض اطلاعات ٹونک کے مولانا محمد عادل خاں ندوی اور کلکتہ کے ڈاکٹر ایاز روہوی کے ذریعہ حاصل ہوئیں۔ **فجزاهما الله ۔**

تبصرۂ کتب

سید ظل الرحمٰن ایک نقش جاوداں: از جناب عزیز بلرامی ، متوسط تقطیع ، عمدہ کاغذ و طباعت ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۲، قیمت ۳۰۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۲۰ء ، پتہ : ابن سینا اکاڈمی، تجارہ ہاؤس، دودھ پور، علی گڑھ ،۲۰۲۰۰۲،موبائل: ۹۳۵۸۲۵۹۷۴۰

نہایت دلآویز، خاموش لیکن مجسم فکر وعمل بلکہ سراپا جلوۂ حکمت و دانش شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں جن کو خدا کی نعمتوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، اس کتاب کے مرتب نے حکیم سید ظل الرحمٰن کا تعارف پہلے ہی جملہ میں علی گڑھ جیسے شہر دانشوراں کے حوالہ سے کرایا ہے۔ ویسے معاً بعد وہ موجودہ تشہیری ماحول کی مناسبت سے یہ وضاحت کرتے ہیں کہ کچھ دانشور تو حصول شہرت کے لیے اپنی دانش کا اظہار موقع ومحل کی مناسبت سے کرتے رہتے ہیں لیکن کچھ دانشور ایسے بھی ہیں جو اپنی قوم کی ترقی یا بالفاظ دیگر علوم وفنون کی ترقی کو مقصد حیات بنا کر اپنے آرام وآسائش کو دانستہ تج دیتے ہیں۔ لائق مرتب نے اپنے ممدوح حکیم ظل الرحمٰن کو ایسا ہی انسان بتایا جو اپنے تعمیری اور مثبت افکار واعمال کی وجہ سے واقع اسم بامسمیٰ ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ حکیم صاحب کی زندگی اور حاصل زندگی کا مطالعہ اوروں نے بھی کیا جس کا اندازہ سات آٹھ کتابوں سے ہوتا ہے ، ایسے میں ظاہر ہے ممدوح کی سیرت وسوانح کی چنداں ضرورت نہیں تھی ، لیکن ابن سینا اکاڈمی میں محفوظ بیش قیمت نوادر اور عجائبات نے دیکھنے والے کو آواز دی کہ جس طرح وہ اب محفوظ ہیں اور دوسروں کی نگاہوں کا مرکز ہیں ، اسی طرح بانی اکاڈمی حکیم صاحب کے قوم وملت کے تعلق سے ان کے تجربات ، احساسات اور زمانہ کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ان کے اپنے پیمانوں کا جائزہ لیا جائے اور خود مسافر حیات سے اس کی حکایت ہستی سنی جائے۔ بحیثیت طالب علم لائق مرتب نے تین برسوں میں استاد کو جیسا دیکھا ، سنا، کوشش کی کہ ایک مرتب گفتگو کے ذریعہ اسے پیش کردیا جائے۔

حکیم صاحب کی شخصیت پر ان کے خاندان ، ماحول ، تربیت ، پھر تعلیم وتدریس کا جو اثر ہے وہ بھی کم دلچسپ نہیں لیکن ابن سینا اکاڈمی میں مسلمانوں کے شاندار ماضی اور ان کی تہذیبی وراثت کو جس طرح نادر مخطوطات اور فن خطاطی کے شاہکار نمونوں اور خاص طور پر طب کے علم وفن سے متعلق نایاب کتابوں کی موجودگی نے جو انفرادیت بخشی ہے، اس میں ایک پہلو ماضی کے سایہ میں مستقبل کے سفر کا بھی پوشیدہ ہے۔ اپنے زمانہ اور

اپنے عہد سے آگے کی نسلوں کا منظر دیکھنے اور اس کے لیے قلب ونظر کی دنیا میں خلش لیے ہوئے ایک بے نام جستجو کی متاع کو زادِ سفر بنانا، اگر دانشوری کی ایک علامت ہے تو اس کتاب میں اسی کو پانے کی کوشش صاف طور پر نظر آتی ہے۔ حکیم صاحب کی گفتگو میں نہ حالات کا ماتم ہے اور نہ مشکلات کی شکایت۔ البتہ وطن اور خاندان کے ذکر میں رومانیت ضرور ہے جو ماضی کی ہر یاد کو سینے سے لگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تجارہ اور الور ہندوستان کے مسلم تہذیبی جغرافیہ میں نمایاں نہیں ہیں لیکن زیر نظر کتابی گفتگو سے ان مقامات کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے ۱۹۴۷ء میں اپنے قصبہ کی تباہی دیکھی، خود ان کے خاندان کے پانچ افراد شہید ہوئے۔ الور اور بھرت پور میں ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کا قتل عام ہوا، جس کو پڑھ کر، یہاں پٹنہ کے کلیم عاجز مرحوم یاد آ گئے۔ جو سبب شاعری کا ہو جاتا ہے وہی ایک طبیب حکیم کے لیے زخموں کے اندمال کی وجہ بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ گفتگو محض ایک طویل انٹرویو نہیں، وہ سفر ہے جس میں اداروں کا اپنا کردار ہے، شخصیتوں کے الگ الگ رنگ ہیں، ان میں بھوپال، علی گڑھ، دہلی، حیدرآباد جیسے شہروں اور ان کے معزز شہریوں کا ذکر ہے، تعجب ہے کہ بے شمار افراد اور اداروں میں دارالمصنّفین کا ذکر نہیں، اگر ہے بھی تو دہلی میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مفتی شوکت علی فہمی کے سلسلہ بیان میں، جس سے احتمال ہوتا ہے کہ یہ دارالمصنّفین بھی اصلاً ندوۃ المصنّفین ہی ہے۔ ایک جگہ البتہ دانش پر جذبات نے غلبہ پالیا۔ جب وہ اسپین میں سفر کر رہے تھے تو وہ اچانک اس سرزمین کو دیکھ کر زار وقطار رونے لگے اور دیر تک روتے رہے کہ جہاں ہم نے صدیوں حکمرانی کی آج وہاں کوئی جاننے والا بھی نہیں، صحیح کہا کہ بغداد کی تباہی سے زیادہ اسپین کا درد ہے، ہمیشہ زندہ! اسی لیے ان کی نظر ہندوستان پر خاص طور پر ہے اور ان کو یقین ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سیکولر نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں، اقلیتوں کو ہر جگہ مسائل کا سامنا ہے، مذہبی شدت پسندی، دوسروں کو زیادہ شدت پسندی پر آمادہ کرتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا ہے لیکن وہ تعلیمی لیاقت اور دوسری صلاحیتوں کی وجہ سے ملک کی ایک بڑی ضرورت ضرور بن سکتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل وہی ہیں جو ایک صدی سے چلے آ رہے ہیں، مداوا ان کا آج تک نہ ہو سکا، اس کتاب میں اس کے لیے کچھ نسخے ضرور ہیں، اور یہ اس لحاظ سے واقعی قابل مطالعہ ہے کہ اس میں ایک کامیاب زندگی اور اپنے وجود کی اہمیت سے باخبر ہونے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ آج شاید خود کو جاننے اور سمجھنے اور اپنی صلاحیتوں کے صحیح استعمال کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ لائق مرتب تبریک وتحسین کے لائق ہیں کہ انہوں نے ایک گفتگو کے ذریعہ اپنے قارئین کو قابل قدر تحفہ دے دیا۔

(عمیر الصدیق ندوی)

نقوش معنی: پروفیسر خالد محمو، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۴۲۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگرنئی دہلی۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل وای میل نمبر درج نہیں۔

تحریر کے رنگ، ادب کی تعبیر، ادب اور صحافتی ادب اور تفہیم وتعبیر کے بعد اب مصنف کے ادبی وتنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ اہل ذوق کے مطالعہ کے لیے حاضر ہے۔ یہ اصل میں ہندوستان کی مشہور و معروف یونیورسٹیوں اور اکیڈمیوں میں پیش کیے گئے بعض غیر مطبوعہ اور مطبوعہ خطبات پر مشتمل ہے۔ اس میں رشید احمد صدیقی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، ولی، شاہ مبارک آبرو، عبدالغفور نسّاخ، علامہ اقبال اور فراق وفیض کے شاعرانہ وادبی کمالات کا باریک بینی ودقتِ نظری سے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک مضمون میں حکیم سید ظل الرحمٰن اور ان کی کتاب بھوپال کا علمی وادبی کارواں پر مفصل اظہار خیال ہے۔ آخری مضمون میں اپنی تدریسی زندگی کے گلہائے رنگارنگ اس طرح بکھیرے ہیں کہ پڑھنے کے بعد مسام فکر ونظر میں عجب قسم کی تروتازگی محسوس ہوتی ہے۔ تدریس ان کے نزدیک پاکیزہ، شریفانہ اور شاہانہ عمل ہے۔ اس کا مقصد محض علوم سے متعارف یا معلومات فراہم کرنا ہی نہیں بلکہ محبت کی راہ سے طالب علم کے دل ودماغ تک پہنچنا ہے۔

یوں تو اس مجموعہ کے بیشتر مقالات کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست کا مصداق ہیں۔ بالخصوص رشید احمد صدیقی صاحب کی اخلاقی خوبیوں اور ادبی سرگرمیوں کا خاکہ خود ان کی تصانیف کی روشنی میں اس انداز سے کھینچا ہے جیسے ایک محقق نے ایک مدت اردو ادب کی اس اہم شخصیت کے فکر وفن کے مطالعہ میں صرف کی ہو۔ ان کا یہ جملہ ''رشید صاحب کا ادبی سرمایہ نہ صرف معیار بلکہ مقدار میں بھی نہایت قابل رشک ہے۔ طنز ومزاح میں تو خیر ان کا دبدبہ تھا۔ عرصۂ دراز تک اس فن کی مملکت پر بلاشرکت غیرے راج کیا ہے۔'' (ص ۱۲) کچھ اسی طرح کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ اقبال کی نظم مکالمہ جبریل وابلیس کا تجزیاتی مطالعہ میں اقبال کے اس پورے فلسفہ کو دلنشین اور سلیس انداز میں سمجھا دیا ہے۔ اس سے صاحب کتاب کی قرآنی آیات اور فلسفۂ تصوف سے یک گونہ دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ شاہ مبارک آرزو اور ان کے رنگ سخن کا عطر کشید کرنے میں بڑی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور ان کے بعض اشعار کے تفہیم وتعین معنی میں لسانی ونحوی گفتگو پڑھنے کے لائق ہے۔ فیض کے اشعار میں طنزیہ عناصر کی تلاش وتفحص کے دوران اس کا مقصد اصلاح معاشرہ اور تنقید حیات بتانا ان کی فکری سلامت روی کی دلیل ہے۔ (ص ۲۰۲) ادبی موضوعات ومسائل پر صاحب کتاب کو خاص دسترس حاصل ہے۔ وسعت مطالعہ

اور دقت نظری ان کا نمایاں وصف ہے۔اسلوب بیان کی سادگی میں قیامت کی ادا وکشش دکھتی ہے۔بیشتر مضامین گرچہ مکمل حوالوں سے عاری مگر مواد سے بھرپور اور لائق استفادہ ہیں۔ **(کلیم صفات اصلاحی)**

مناظر گیلانی (احوال وآثار): ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔صفحات:۱۶۸۔ ملنے کا پتہ: مکتب الانوار شاہ منزل محلّہ خانقاہ، دیوبند۔ قیمت: ۱۷۰روپے۔سن طباعت:۲۰۲۰ء۔موبائل نمبر:۸۱۷۱۵۵۴۵۲۶۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کے احوال وآثار اور ان کے دستیاب اشعار پر مشتمل یہ مجموعہ پہلی بار ۲۰۰۷ء میں شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہوچکا ہے۔طبع اول کے وقت ہی اس کے مرتب نے ان کے کلام کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ مکمل نہیں ہے۔اب سعی مزید کے نتیجہ میں ان کی دوسری ناقص نظمیں اور مرثیے وغیرہ حاصل ہوئے تو جدید ترتیب کے ساتھ مجموعہ کو دوبارہ شائع کیا ہے۔نو حمد ونعت، ایک سہرا اور تین مرثیے ،۲۴ اشعار کے اضافہ کے ساتھ ''شکوۂ خواجہ'' کی تکمیل، مثنوی خواب وطن کے مکمل اشعار، تین ناقص نظمیں اور دس سے زائد متفرق اشعار کا اضافہ اس طبع جدید میں شامل اور یہ قند مکرر الگ لطف وذائقہ کا حامل ہے۔

مولانا گیلانی کو زبان وبیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ان کی نثر پر سیل رواں کا گمان ہوتا ہے۔ شعروشاعری کا نہایت صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے جس کا اعتراف مولانا دریابادی اور ڈاکٹر غلام محمد صاحب جیسے سخن شناسوں نے کیا ہے۔ان کے کلام کا بیش تر دستیاب حصہ نظم ونعت اور مرثیہ پر مشتمل اور کسی خاص عنوان سے معنون اور جدت لیے ہوئے ہے۔مثلاً مگدھی بہاری نعت کا عنوان وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین اور بعض نظموں کا ایہا المسلم ، جرم مولوی اور نسل آشوب وغیرہ ہے۔یوں تو اس مجموعہ میں کوئی غزل نہیں ہے لیکن طبع دوم کے پیش لفظ میں غزل گوئی اور مشاعروں میں مولانا گیلانی کی شرکت کا انکشاف بھی کیا گیا ہے۔بعض نعتیں اور نظمیں ایسی ہیں جو اردو، فارسی اور عربی اشعار کا سنگم ہیں۔ایسے قادر الکلام شاعر کے معیاری کلام کا اصل لطف مطالعہ سے ملے گا۔مرتب نے اس کو شائع کرکے شعروادب کے ذخیرہ میں شاندار اضافہ کیا ہے۔اس کے لیے وہ اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔ **ک،ص اصلاحی**

عورت قرآن کریم میں، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات:۳۵۲، قیمت ۴۵۰/روپے، پتہ: مرکز تحقیقات اسلامی پٹنہ، سن اشاعت ۲۰۲۱ء، موبائل ۹۷۰۸۰۱۱۵۳۴

خطبۂ حجۃ الوداع کی حیثیت ایک منشور حیات کی ہے، اس میں رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

اے لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور ان کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں۔

عورت دراصل انسانی سماج کا وہ حصہ ہے جو مردوں سے عددی لحاظ سے قریب برابر ہونے کے باوجود ہمیشہ کمزور سمجھا گیا اور اسی لیے استحصال کا بھی شکار ہوا، اسلام اور پیغمبر اسلام نے مذہبی اور سماجی دونوں طرح اس طبقہ کی حرمت و عظمت کا اعلان کیا، لائق مصنف نے اس تشریح کے لیے صرف قرآن کریم کے بیان سے روشنی حاصل کی اور بتایا کہ قدیم مذاہب اور تہذیبوں نے کس طرح عورت کو ناپاک، منحوس، شیطان کا آلہ، حتی کہ زہریلے اور خطرناک حشرات الارض سے بھی پست قرار دیا، جس کی وجہ سے وہ زندہ درگور کر دینے کی سزا وار بھی ہوئی، ایسے ماحول میں عورتوں کی خودداری، عزت نفس اور معاشرہ میں ان کی اہمیت، قرآن کریم نے پرزور طریقے سے واضح کی۔ اس نے حجاب و حیا کے عنوان سے حفاظت نسواں کے اصول بھی متعین کیے تاکہ افراط و تفریط سے بچا جا سکے، جو جاہلیت قدیم اور اب جدید دور جہالت کی دین ہے۔

چوں کہ اسلام دین فطرت ہے، اس لیے اس نے عورتوں کے جائز حقوق متعین کیے اور دنیا کو یہ پیغام دیا کہ عورت جیسی صنف نازک مخلوق کے ساتھ کسی بھی حال میں ناانصافی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ حقیقت بھی واضح کی کہ ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ کے وجود کی ضامن صرف عورت ہے۔

کتاب کے بارے مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ نے فرمائی اور لکھا کہ:

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن صاحب نے ان سب حقائق کا پورے انصاف اور دقتِ نظر کے ساتھ قرآن مجید کی روشنی میں جائزہ پیش کیا ہے، اس طرح ان کی یہ تصنیف وقت کی ایک ضرورت کے طور پر سامنے ہے، جس کے لیے میں انہیں تہنیت پیش کرتا ہوں...... اور توقع رکھتا ہوں کہ دوسری زبانوں میں اس کو منتقل کر کے اس عمومی غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے گا، جو اسلام کے تعلق سے عورتوں کے بارے میں پھیلی ہوئی ہے۔ (ص ۲۵)

کتاب کئی ابواب جیسے عورت مذاہب عالم میں، عورت معروف قدیم تہذیب میں، عورت جدید مغربی تہذیب میں، مذاہب عالم اور جدید مغربی تہذیب، قرآن کریم کی انقلابی تعلیمات و پیغامات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ایک باب میں عورتوں سے متعلق چند سورتوں کا تعارف ہے اور اس سے عمدہ بات یہ ہے کہ قرآن میں جن موضوعات اور آیات میں خواتین کا ذکر ہے ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

آج کے دور میں اس قسم کی کتابوں کی افادیت ظاہر ہے، کوشش ہونی چاہیے کہ ایسی کتابوں کا مطالعہ عام ہو۔ یقیناً ہر مسلم گھرانہ تک یہ کتاب پہنچنی چاہیے۔ **(فضل الرحمٰن اصلاحی)**

غزل

جمیل مانوی

سہارنپور

یہی تو ہے کہ مصائب میں مبتلا ہوں میں
یہ کم ہے میرے لیے تیرا مدعا ہوں میں

ادھورے پیار کی لذت سے آشنا ہوں میں
اسے خبر بھی نہیں جس کو جانتا ہوں میں

براہِ راست تعلق نہیں مگر پھر بھی
اداس جب اسے دیکھا تڑپ گیا ہوں میں

بتا تو دے مری منزل کہاں ہے اور راہ کہاں
مرے رفیق سفر کتنا تھک گیا ہوں میں

میں اب یہ بوجھ اتاروں تو کچھ سکون ملے
مرا یہ وہم کہ دنیا سے آشنا ہوں میں

مجھے تو لذتِ کام و دہن نے مار دیا
جو سطحِ آب پہ تنکا سا تیرتا ہوں میں

ذرا سنبھل کے مری دوستی کا دم بھرنا
دلوں کو درد کی سوغات بانٹتا ہوں میں

مرے سلیقہ سے وحشت ہے کم سوادوں کو
اسی لیے تری محفل سے اٹھ گیا ہوں میں

نہ فکر میں وہ بلندی نہ عزم میں وہ ثبات
یہی سبب ہے کہ دردر بھٹک رہاں ہوں میں

قدم قدم پہ ہزیمت نفس نفس پہ عذاب
کوی امید تو ہے جس پہ جی رہا ہوں میں

ملی ہے مہلت غم بس یہی غنیمت ہے
اسی کو عینِ حسرت سمجھ رہا ہوں میں

ہزاروں داغ ہیں دامن پہ جان جاں لیکن
یہ داغ بھر بھی نہیں ہے کہ بے وفا ہوں میں

ترے لوک نے خود بیں بنایا ہے مجھے
یہ دیکھ اپنے ہی زخموں سے کھیلتا ہوں میں

مرا علاج مسیحا کے بس کی بات نہیں
خود اپنے درد کی لذت پہ مرمٹا ہوں میں

☆

غزل

وارث ریاضی
سکٹا (دیوراج) پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔۸۴۵۴۵۳

ماحول میں شدت کی گھٹن دیکھ رہا ہوں
آنکھوں میں نمی، دل میں چبھن دیکھ رہا ہوں

یہ جور و تشدد کے سلگتے ہوئے شعلے
جلتے ہوئے انساں کے بدن دیکھ رہا ہوں

اخلاص و محبت کی گئی بات جہاں سے
ہر شخص کو نفرت میں مگن دیکھ رہا ہوں

یہ بغض و عداوت، یہ تعصب، یہ مظالم
پامالیٔ تقدیس میں وطن دیکھ رہا ہوں

فصلِ گل و لالہ میں خزاں کا یہ تسلط
نیرنگیٔ تصویرِ چمن دیکھ رہا ہوں

سچ بات بھی کہنے میں تامل، ارے توبہ
کم ظرفیٔ اربابِ سخن دیکھ رہا ہوں

یہ ضعفِ بصارت ہے کہ فقدان بصیرت
مسموم فضاؤں میں عدن دیکھا رہا ہوں

اے شیخ حرم! تیرے تقدس کی ادا میں
سرمستیٔ صہبائے کہن دیکھ رہا ہوں

دل کانپ اٹھے جس کے تصور ہی سے وارثؔ
وہ سلسلۂ دار و رسن دیکھ رہا ہوں

معارف کی ڈاک

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

معارف نومبر ۲۰۲۳ء کا شمارہ دستیاب ہوا۔ سبھی مندرجات حسب معمول پڑھ لیے، چند چیزیں دوران مطالعہ کھٹک رہی ہیں۔

صفحہ ۷ پر ''تفسیر شاہ صاحب کے انتقال کے آٹھ سال بعد ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں پہلی مرتبہ کلکتہ سے طبع ہوئی، دوسری مرتبہ یہ تفسیر ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں کانپور سے طبع ہوئی''۔

اس سے پہلے (نمبر ۱۰) حاشیہ ہے ''تفسیر فتح العزیز، مطبع حیدری بمبئی، ۱۲۴۹ھ'' جب بمبئی سے ۱۲۴۹ھ میں طبع ہوئی تو دوسری مرتبہ کے لیے متن میں کانپور سے ۱۲۶۱ھ کیسے ہوئی، اگرچہ دونوں نسخے الگ الگ لوگوں کے املا کردہ ہیں اور بمبئی والے نسخے میں اختصار بھی ہے، کیا الگ الگ موقع پر املا کروایا گیا؟ صفحہ ۲۷ آخری سطر ''رائے راست پر چلنے کی ترغیب بھی دیتی ہے'' رائے راست کی جگہ راہِ راست صحیح نہ ہوگا۔ اس مقالہ میں گیتا کے اشلوکوں کے حوالہ کے لیے کبھی ۱ ''دل کی گیتا'' تو کبھی ۲ ''شریمد بھگوت گیتا'' اور کبھی ۳ ''عرفان'' یا ۴ شریمد بھگوت گیتا اصلی صورت میں'' اسی طرح ۵ ''مخزن اسرار'' اور ۶ '' کلام ربانی'' ۷ ''اردو شاعری میں گیتا ونغمہ ''علم وعمل'' غرض ہر جگہ الگ نسخوں کا حوالہ ہے کیا اور نسخوں میں نہیں ہے یا سب ہی میں ہے۔

صفحہ ۴۷ (سطر ۱۳-۱۷) ''ان قلب و ذہن کی وسعت وکشادگی'' میں شاید ''ان'' کے بعد '' کی'' چھوٹ گیا ہے، صفحہ ۷۷ ''پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے نام ۲۲، ۲۲ اور پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کے نام ۱۸، ۱۸ عنایت نامے ہیں'' سے تو پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کے نام پروفیسر مقصود احمد صاحب نے خطوط لکھے جبکہ تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ہی خطوط لکھے ہیں، معارف کے بیک کور پر مطالعات شبلی، شبلی شناسی کے اولین نقوش اور شبلی کی آپ بیتی'' تینوں میں ش کا تیسرا نقطہ غائب ہے۔

والسلام

شاہ ظفر الیقین

گیانپور۔ بھدوہی

رسید کتب موصولہ

احکام طلاق (انوار الاخلاق فی مسئلۃ الطلاق): ابوالفوزان کفایت اللہ سنابلی، اسلامک انفارمیشن سینٹر، کرلا ممبئی، صفحات: ۸۸۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۸۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۷۰۴۵۷۸۸۲۵۴

تفسیر ماجدی ایک جائزہ: نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی، براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۱۴۳، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۰۶۸۶۳۴۴۶۱۷

جنتیں مشتاق ہیں: ڈاکٹر کمال حیدر رشید الاعظمی، اقبال بک ڈپو، مفتی گنج چوراہا، لکھنؤ، صفحات: ۵۲۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۴۵۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۷۵۷۸۵۷۵۲۷

عہد وسطیٰ کا ہندوستان- تاریخی وثقافتی ورثہ: ڈاکٹر فیضان احمد اعظمی، البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۳۳۲، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۵۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۹۷۱۴۷۷۶۶۵

فہم حدیث کے بنیادی اصول: ڈاکٹر عبدالصبور ابوبکر، مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس، یو. پی، صفحات: ۳۴۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۴۳۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۵۹۹۷۰۲۱

کلام اقبال (موضوعاتی ترتیب): ابن غوری، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلما، لکھنؤ، صفحات: ۴۴۳، سالِ اشاعت ۲۰۱۹ء، قیمت: ۳۰۰/روپے، فون نمبر: ۰۵۲۲-۲۷۴۱۵۳۹

کلیات خطباتِ شبلی: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، صفحات: ۳۴۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۴۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۱۱-۲۳۲۳۷۷۲۲

نگارشاتِ مولانا خالد کمال: مرتب: مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، مکتبہ ضیاء الکتب خیر آباد، ضلع مئو، (یو. پی) صفحات: ۴۲۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۵۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۲۳۵۳۲۷۵۷۶

مقالاتِ پروفیسر شاہ عبدالسلام: مرتب: ڈاکٹر شاہ محمد فائز، دانش محل، امین آباد، لکھنؤ، صفحات: ۲۲۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۹۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۵۵۹۷۶۴۱۶۰

مولانا عبدالسلام مدنی حیات اور خدمات: رفیع احمد محمد عاقل مدنی، مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، (یو. پی)، صفحات: ۲۲۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۸۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۶۰۱۰۲۲۴

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول 〃 〃	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم 〃 〃	190/-
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

MAY 2022 Vol- 211(1) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعاتِ شبلی	//	550/-
حیاتِ سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازیؒ	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	600/-
تذکرۃ المحدثین اول	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	200/-
تذکرۃ المحدثین دوم	//	225/-
تذکرۃ المحدثین سوم	//	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلی	330/-
تاریخ اسلام اول و دوم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	560/-
تاریخ اسلام سوم و چہارم (مجلد)	//	500/-
تاریخ صقلیہ اول و دوم (مجلد)	سید ریاست علی ندوی	800/-
تاریخ اندلس (چار جلدیں)	//	1200/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	550/-